ہمارے
ہندستانی مسلمان

تالیف

ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر، ایل ایل ڈی۔ آئی۔ سی۔ ایس (بنگال)

سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین پر جو ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی ایک آخری اور زبردست کوشش تھی مفصّل تبصرہ۔ حامیانِ تحریک کی حیرت انگیز تنظیم اور اُن کی ایمان افروز قربانیوں کی داستان۔ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث اور جہاد کی حقیقت۔ علاوہ ازیں انگریزی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں سے جو ناانصافیاں ہوئیں اُن کا دردانگیز بیان۔

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈیمی

۵۴۔ سرکلر روڈ۔ بیرون موچی دروازہ لاہور

قیمت ۱۲/۲ عہ

ہمارے
ہندوستانی مسلمان

کیا وہ اپنے ضمیر کے مطابق ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہیں؟

مصنفہ

ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر، ایل، ایل، ڈی، آئی، سی، ایس، بنگال،

مترجمہ

ڈاکٹر صادق حسین، ایم، بی، بی، ایس

ملنے کا پتہ:-

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی گیٹ لاہور

(محمد سعید ہاشمی)

قیمت دو روپے بارہ آنے

انتساب

شملہ ۲۳ جون

میرے پیارے

میں آپ کی اُن کوششوں کی بنا پر جن سے میں نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے یہ چھوٹی سی کتاب آپ کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں سول سروس کے تمام علم دوست حضرات میں سے آپ ہی ہیں جنہوں نے قوموں کے سمجھنے کی اہمیت کا پورا پورا احساس کیا ہے۔ سب سے بڑی بے انصافی جو انگریز اپنی ایشیائی رعایا سے کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اُن کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ برطانوی حکومت کو ہندوستان میں جو مستقل خطرہ درپیش ہے وہ فاتح اور مفتوح کا تفاوت ہے میں نے اس کتاب میں اس جنگجو جماعت کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ ضروریات کو با لوضاحت بیان کر دیا ہے جس کے متعلق ہندوستان کے انگریزی حکام نے بار بار اعلان کیا تھا کہ وہ ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

براٹین ہوفٹن ہوحسن امکوائر
ایبلڈرنے گرینج
گلوسسٹر شائر

میں ہوں آپ کا خیر اندیش
ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر

فہرست مضامین

	نمبر صفحہ
باب اوّل :-	
ہماری سرحد پر باغی کیمپ	۱۷
باب دوم :-	۷۰
ہمارے مقبوضات میں پرانی سازش	
باب سوم :-	۱۶۲
مسلمان علماء کا فتوے	
باب چہارم :-	۲۱۵
برطانوی عہد میں مسلمانوں سے ناانصافیاں	
ضمیمہ	
(۱) مکہ معظمہ کے علماء کا فتوے	۳۱۰
(۲) شمالی ہند کے علماء کا فتوے	۳۱۳
(۳) کلکتہ کی محمڈن سوسائٹی کا فیصلہ	۳۱۵

دین محمدی پریس بیرون اکبری گیٹ میں باہتمام ملک محمد عارف خان صاحب چھپوا کر سید محمد شاہ ایم اے
مہتمم اقبال اکیڈمی نے ۵۴ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی گیٹ لاہور سے شائع کیا۔

دیباچہ

بیا تا گل بفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اس وقت قومیں تغیر و انقلاب پر آمادہ ہیں اور مسلمانانِ ہند بھی اس عالمگیر تحریک سے الگ نہیں رہ سکتے۔ دُنیا کے بدلے ہوئے حالات اور ہندوستانی سیاست کے تازہ واقعات نے اُن کی حیاتِ ملّی کو زندہ کر دیا ہے۔ اُنہیں بھولا ہُوا خواب پھر نظر آنے لگا ہے۔ احیائے ملّت کا جذبہ جو دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ تھا پھر اُبھر رہا ہے اور قوم کا سمجھدار طبقہ قومی ہستی کو برقرار رکھنے اور اُس کے نشوونما کے وسائل سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ وسائل کیا ہیں؟ بس اس ایک سوال کے جواب پر ہماری قومی حکمت کا عملی دارومدار ہے۔

تقلیدِ مغرب کی وبا عام ہو چکی ہے اور اسے دیکھ کر خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی اپنی حکمتِ عملی کو وضع کرتے ہوئے ضابطۂ الٰہی کو پس

پشت ڈال کر ذلت و نامرادی کے کبھی ختم نہ ہونے والے چکر میں پھنس جائیں اس لئے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں ایک تو یہ دیکھنا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی الہامی شاہراہ کونسی ہے جس پر گامزن ہو کر ہمارے آباواجداد امۃ وسطا کے مخصوص لقب سے ملقب ہوئے اور وہ معجزانہ قوت حاصل کی جس سے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ گئے۔ روم الکبریٰ کی سطوت خاک میں مل گئی۔ تعبّد و غلامی کی زنجیریں ایک ہی جھٹکے میں پارہ پارہ ہو گئیں۔ اس شاہراہ کامرانی کی کلید آپ کو ملے گی تو بس قرآن و حدیث میں۔ ثانیاً ہمیں اُن حالات کا بھی جائزہ لینا ہے جن کے زیر اثر ہماری قومی عظمت کی کھیتی جس کی شادابی پر ایک زمانے کو ناز تھا دیکھتے دیکھتے ویران ہو گئی اور اس کے گلہائے رنگارنگ بکھر کر اغیار کی زیب و زینت کا سامان بن گئے ان حالات سے آگہی تاریخ کی ورق گردانی کے بغیر ممکن نہیں۔ پس حیات ملی کی از سر نو ترتیب و تعمیر میں صحیح واقعات کا جاننا اور تاریخ سے زندہ تعلق پیدا کرنا ازبس ضروری ہے۔

فاتح کبھی بھی ملک گیری پر قناعت نہیں کرتا وہ مفتوح کی رہی سہی استعداد کردار اور قومی سیرت کی تخریب کے درپے رہتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اُس کی غلامی کی زنجیریں مضبوط نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان کے مسلمان ڈیڑھ صدی سے اسی جان گسل جد و جہد میں مصروف ہیں کہ اپنی ملی ہستی کو قائم اور برقرار رکھ سکیں۔ لیکن ہندوستان میں مختلف قوموں کی موجودگی نے

اس کشمکش کو اور بھی سخت کر دیا ہے۔ ہم میں زندگی کی رمق اگر ابھی تک باقی ہے تو یہ ہمارے سخت جان اور پختہ کار ہونے کی بین دلیل ہے اور ایک کوتاہ بین سے کوتاہ بین تک کو بھی اس میں اُمید کی جھلک نظر آئے گی۔

حکومت چھن جانے کے بعد ہماری قومی زندگی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کیا کیا طریقے استعمال کئے گئے اور ہم نے اُس کے مقابلے میں کیا کچھ کیا اس کے متعلق چند سالوں کی مختصر مگر جامع تاریخ آپ کو اس کتاب کے اوراق میں نظر آئے گی۔ یہ اُس انگریز کے فکر و مطالعہ کا نتیجہ ہے جس نے اس جدوجہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جسے خود بھی حکومت میں بڑا اقتدار حاصل تھا اور جس کی رسائی ارباب حل و عقد تک بے روک ٹوک ممکن تھی لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا کہ واقعات کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھے بایں ہمہ اُس کا قلم واقعات کا انکار نہ کر سکا۔

اُنیسویں صدی کی تاریخ ہندوستان نے اصلاح و تجدید کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں، اُن میں کوئی شخصیت بھی اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں اس قدر غیر معمولی نہیں جس قدر حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمتہ تھے۔ اس کتاب کے پہلے دو ابواب میں حضرت امیر شہید کی تحریک حق و صداقت کو جو مسلمانوں کو اُن کی انفرادی اور ملی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں مسلمان بننے کی دعوت دیتی تھی اور جسے بعد میں "وہابیت" کا نام دے دیا گیا تھا وضاحت سے

بیان کیا گیا ہے گویا یہ ہماری انفرادی اور ملی زندگی کو تخریب و ہلاکت سے بچانے کے لیے پہلا قدم تھا جو اٹھایا گیا اور جس کی کامیابی کو دیکھ کر جناب امیر شہید اور اُن کے رفقاء کی قوت عمل اور پختگیٔ ایمان و یقین پر حیرت ہوتی ہے۔ کیا مسلمانوں میں کبھی یہ جذبہ موجود تھا کہ وہ اُس کارخانے کے مالک کو جہاں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتے، صاف صاف کہہ دیں کہ ہمیں چند مہینوں کی رخصت دی جائے تاکہ ہم مجاہدین کی صف میں کھڑے ہو سکیں؟ دینی فریضہ جہاد کی انجام دہی کا یہ جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پایا جاتا تھا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ شہری ہو یا دیہاتی، عوام ہوں یا خاص۔ مختصر یہ کہ ہر فردِ ملت اس نشے میں سرشار تھا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل، سب ایک ہی دھن میں لگے ہوئے تھے اور حوادث روزگار سے بے پروا ہو کر جس راہ پر گامزن ہوئے اس سے سر مو انحراف نہ کیا۔

حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام تھا اور اسی لیے پہلے اُن کا مقابلہ سکھوں سے اور بعد میں انگریزی حکومت سے ہوا جناب سید صاحب کی ابتدائی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے اُن کی شان میں مصنف نے جو گستاخانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اُن پر تعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ مغربی تاریخ نگاروں کا یہ ہمیشہ اصول رہا ہے کہ ملت کے یہ وفادار سرفروش اگر یورپ میں ہوں تو انہیں قومی اور مذہبی زندگی میں بلند ترین

مقام پر جگہ دی جاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر اُن کا تعلق سرزمین ایشیا اور بالخصوص اسلام سے ہو اور وہ کسی مغربی سے برسرِ پیکار ہو تو اُس سے زیادہ ذلیل، انسانیت کا خون کرنے والا اور امن پسند شہریوں کی جائداد و املاک کو لوٹنے والا اس دُنیا میں کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ چاہے کہ اُس کی لاش بھی قبر سے کھُدوا کر جلا دی جائے۔ مجاہدین کے لئے "باغی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دو متضاد قوانین میں سے ایک کی پُرجوش حمایت دوسرے بغاوت کے مترادف ہے۔ بحیثیت مترجم میں بھی شاید مصنف کے الفاظ ہی استعمال کرتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ پنجاب اور صوبہ سرحد بلکہ تمام ہندوستان میں یہ سرفروش گروہ "مجاہدین" کے نام سے مشہور ہے اور اس سے قارئین کرام کو واقعات کی رفتار ذہن نشین کرانے میں آسانی ہوگی۔

سید احمد علیہ الرحمۃ اپنوں میں کس قدر ہردلعزیز تھے اس کا اندازہ اُن کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے جوش و خروش کے علاوہ اس واقع سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب آپ کلکتہ یا بمبئی میں وارد ہوتے تو مرید بننے والوں کا ہجوم اس قدر زیادہ ہوتا کہ آپ اپنی دستار کھول کر اس حکم کے ساتھ پھیلا دینے پر مجبور ہو جاتے کہ جو شخص بھی اسے چھوئے گا بس وہ میرا مرید کہلائے گا اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا ہے جب پروپیگنڈا اور نشر و اشاعت کے موجودہ وسائل اور طریقوں سے دُنیا ہنوز ناآشنا تھی۔

حضرت امیر شہیدؒ کی شہادت کے بعد مجاہدین کی تحریک، اُن کے لیڈروں کے طرزِ عمل اور طریق کار پر بھی خوب بحث کی گئی ہے۔ بہت سے واقعات کا انکشاف مقدمات کے دوران میں ہوا ہے۔ اس ضمن میں کئی ایک پیشگوئیاں بھی درج کی گئی ہیں اور چند کتابوں کا ذکر بھی ہے۔ کچھ تو اُن میں ایسی ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور باقی ماندہ کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔ سرحدی جنگوں کی روداد سرکاری دستاویزوں سے مرتب کی گئی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے ان ابواب کا بغور مطالعہ کرنے سے عام مسلمانوں کا رجحانِ طبیعت اور ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مزید روشنی پڑے گی اور ان کے اسباب بہت حد تک سمجھ میں آجائیں گے۔

تیسرے باب میں مسئلہ جہاد زیرِ بحث آیا ہے ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے کے متعلق بھی کئی ایک نظریئے پیش کئے گئے ہیں اور اُن کے متعلق علماءِ دین کے فتوے بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس مذہبی بحث میں اُلجھنا ایک بہت بڑی جسارت ہے جسے اور تو اور میں خود بھی پسند نہیں کرتا البتہ اپنے ایک پختہ یقین کو پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

اُنیسویں صدی کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ

یورپ نے اپنے الحاد و بے دینی کے باوجود بے انداز دولت صرف کر کے مبلّغین کی بہت بڑی تعداد ہندوستان اور عالمِ اسلامی میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بھیجی۔ لیکن اس قدر صرف کثیر کے باوجود اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہُوا اور مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر تثلیث کے جھنڈے تلے جمع کرنے میں اُسے مُنہ کی کھانی پڑی۔ یورپ کی یہ تبلیغ اُس کی عیسائیت پرستی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس لئے تھی کہ مبلغین کی یہ جماعت "ملوکیت" کے ہراول دستے کا کام دیں اور باقاعدہ تسلّط کا راستہ صاف کرنے کے لئے اُس مُلک میں دینی عصبیت اور مخصوص مفاد پیدا کرنے کی سعی کریں۔ مسلمانوں میں جب براہ راست دینی تبلیغ ناکام رہی تو ملوکیت کے پرستار ایک نیا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُس زمانے میں مسئلہ جہاد ہندوستان میں ایک عام موضوع بنا ہُوا تھا اور بقول مصنف ہر دیندار مسلمان اپنے عقیدے کا علی الاعلان اظہار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس ضمن میں سرحدی جنگوں اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے علاوہ بہت سے دیگر واقعات پیش آئے جن کا بیان طوالت سے خالی نہ ہوگا اور بالآخر ۱۸۷۲ء میں لارڈ میو وائسرائے ہند انڈیمان کا دورہ کرتے ہوئے پورٹ بلیر (PORT BLAIR) کے مقام پر ایک پٹھان کے ہاتھوں

قتل ہوا اور ملزم نے اپنے بیان میں اسے کارِ ثواب بتلایا۔ واقعات کی رفتار صاف صاف بتلا رہی ہے کہ ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں، جہاں کہیں مغربی شہنشاہیت نے قدم رکھا، ایسے "انبیا" کا مبعوث ہونا کیوں ضروری ہو گیا جن کا مقصد وحید اس ضلالت وطغیان سے بھرپور دنیا میں صرف مسئلہ جہاد کی توضیح و تشریح تھا۔ اس مسئلہ کے ساتھ بعض دیگر غیر ضروری مسائل کو اس طرح غلط ملط کیا گیا کہ ہمارے علمائے کرام اُن کا رد لکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ چنانچہ مسئلہ جہاد اور اُس کی سیاسی اہمیت کو پس پُشت ڈال دیا گیا اور یہی منشا "خداوندی" تھا۔ پس مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے "انبیا" کا مبعوث ہونا ناگزیر ہے۔

آخری باب موجودہ رفتار زمانہ کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور زیادہ تر یہی اس کتاب کے ترجمے کا باعث ہُوا۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہماری شیرازہ بندی کی اہم کڑیاں کونسی ہیں اور انہیں کس طرح بکھیرا گیا اور اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو اور خصوصاً اس کے نوجوان طبقے کو اپنے دل سے یہ خیال حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے کہ اُن میں سربلندی اور حاصل کردہ قوت کے صحیح اور جائز استعمال کی اہلیت نہیں یا وہ اور قوموں کے مقابلے میں پست ہمت اور سرمایہ عقل و دانش میں کمتر ہیں

اگر فی زمانہ وہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں میں کماحقہٗ کامیاب نہیں ہو رہے تو اس کا سبب بیرونی اثرات ہیں جن کا مقابلہ استقلال اور ایمان کی پختگی سے کیا جاسکتا ہے۔ راہ کی مشکلات اور مدت کی زیادتی سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ مخصوص تہذیب و تمدن کے علمبردار ہونے کے باعث اُن کی راہ اَوروں سے مختلف ہے اس لئے ذرا دشوار بھی۔ اگر غیر اقوام کی تقلید کرتے ہوئے صحیح راہ سے بھٹک گئے تو بظاہر برتری ہماری ذِلت کا باعث ہوگی اور پھر ہم جئے بھی تو ہمارا جینا بے کار ہوگا۔ ہاں اگر دانش قرآنی کے چشمۂ سرمدی سے فیض یاب ہو کر ہمت و استقلال کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چل نکلیں تو لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کا عملی اطلاق اب بھی ہم پر ہو سکتا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

طور منزل۔ ۵۹ بیڈن روڈ لاہور
مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۴ء

صادق حسین

باب اوّل

ہندوستان کی سرحد پر ایک باغی کیمپ

بنگال کے مسلمان ایک دفعہ پھر عجب کش مکش میں مبتلا ہیں۔ سالہا سال سے سرحد کے مجاہدین کی نوآبادی ہماری سرحد پر چھاپے مار رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ متعصب لوگوں کے گروہ بھیج دیتی ہے جو ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہمارے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں چنانچہ ہماری فوج کو اُن کے ساتھ تین تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں۔ اس مخالف نوآبادی کے لئے نہایت ہی منظم طریقہ پر بنگال میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے مختلف سازشی مقدمات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سازش کا یہ جال ہمارے تمام صوبوں میں پھیلا ہوا ہے

چنانچہ پنجاب سے پرے کا غیر آباد کوہستانی علاقہ گرم تک کی اُن دلدلوں سے جہاں پر دریائے گنگا سمندر میں جا گرتا ہے اس قسم کے مسلسل سازشی اداروں سے ملا ہُوا ہے۔ اُن مقدمات سے ایسے سازشی اداروں کا پتہ بھی چلا ہے جو گنگا[1] کے دہانے سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ روپیہ اور آدمی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ہماری جرنیلی سڑک پر منزل بمنزل گزارتے ہوئے باغی کیمپ میں پہنچا دیتے ہیں جو یہاں سے دو ہزار میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑے بڑے ذہین اور دولتمند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں اور روپیہ پہنچانے کے طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک نہایت ہی خطرناک کام ہے کمال ہوشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا گیا ہے

جو مسلمان زیادہ متعصب ہیں وہ تو کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہے ہیں اور باقی تمام مسلمان علانیہ جہاد کی فرضیت پر بحث میں مصروف ہیں۔ چنانچہ گذشتہ نو ماہ سے بنگال کے سرکردہ اخبارات نے اس بحث پر کالم کے کالم سیاہ کر دیے ہیں کہ مسلمانوں پر ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کا فرض عاید ہوتا ہے یا نہیں۔ سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے علماء کا متفقہ فتویٰ شائع کیا گیا اور اس کے بعد بنگال کے مسلمانوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ شائع کیا۔ شیعہ جماعت بھی جو ہندوستان میں بہت

---

[1] یعنی جنوبی بنگال

ہی اقلیت میں ہے کچھ نہ کچھ شائع کرنے سے گریز نہ کرسکی۔ کچھ مہینے تو ہمارے اینگلو انڈین اخبارات اُن چند وفادار مسلمانوں کا مذاق اڑاتے رہے جو بڑی سرگرمی سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں سرگرداں تھے کہ اگر ہم نے ملکہ کے خلاف بغاوت نہ کی تو کیا ہم اپنی رُوح کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ مگر علماء اور فقہاء کے متفقہ فتوے کی اشاعت کے بعد ہمارے ہم وطنوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ یہ مسئلہ مذاق ہی مذاق نہیں بلکہ ایک خطرناک پہلو بھی رکھتا ہے۔ وہ متعلقہ کاغذات جو خود مسلمانوں نے شائع کئے ہیں اس بات کا صاف صاف پتہ دے رہے ہیں کہ اس وقت ہماری ہندوستانی سلطنت ایک نہایت ہی خطرناک دور سے گزر رہی ہے ۔

اس شائع شدہ مواد سے ہر عقلمند آدمی کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا ندر طبقہ تو کئی سال سے کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہا ہے اور باقی تمام قوم ایک نہایت ہی اہم ملکی مسئلہ میں پریشان ہو رہی ہے۔ "بغاوت کے فرض" کو باقاعدہ طور پر اور علی الاعلان شریعت اسلامی کا ایک اہم قانونی مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے عقیدہ کا اظہار کرے اور اپنے ہم مذہبوں کے سامنے کھلم کھلا بتلائے کہ وہ سرحد پار کے باغی کیمپ میں کچھ نہ کچھ حصہ لے گا

یا نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے متعلق قطعی فیصلہ کرے کہ آیا اُسے ایک سچے مجاہد مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنا ہے یا ملکہ معظمہ کی پُرامن رعایا کی حیثیت سے مسلمانوں نے کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے صرف ہندوستان کے علماء ہی کے فتووں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ مکہ معظمہ کے علماء تک بھی پہنچے ہیں اور کچھ مہینوں تک تو مسلمانان ہندوستان پر بغاوت کرنے یا نہ کرنے کے فرض کا تصفیہ مکہ معظمہ کے تین اہل سنت و جماعت علماء کے فتوے پر منحصر رہا۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر اپنی مسلمان رعایا کی اس مضطربانہ کیفیت سے بحث کروں جس نے تین صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔

میں اُن واقعات کا جن کی وجہ سے ہماری سرحد پر باغیوں کی نوآبادی قائم ہوئی اور اُن خوفناک نقصانات میں سے بعض کو بھی جو اس کی وجہ سے سلطنت برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے قارئین کے سامنے عملاً بیان کروں گا۔ اور دوسرے باب میں باغیوں کی اس تنظیم کا ذکر کروں گا جس کے ذریعہ سے باغی کیمپ نے ہماری سلطنت کے اندرونی اضلاع سے آدمی اور روپیہ مسلسل طور پر حاصل کیا۔ پھر میں اُن شرعی مباحث کی تفصیل بیان کروں گا جن کی بنا پر تشویشناک حالات رونما ہوئے۔ یہ وہ مباحث تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا

عام طبقہ کس پُرجوش طریقہ پر باغی پیشواؤں کی زہر آلود تعلیم سے متاثر ہو رہا ہے اور کس طرح مسلمانوں کا ایک طبقہ جو تعداد میں بہت ہی کم ہے فرض جہاد سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے شریعت مقدسہ میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کر رہا ہے۔ لیکن اگر میں صرف اسی پر بس کردوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ میں نے پوری بات بیان نہیں کی مسلمانان ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے، اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چوتھے باب میں مسلمانوں کی اُن شکایات کو جو انہیں انگریزی عہد حکومت میں پیدا ہوئی ہیں، معلوم کروں اور اُن کی واقعی شکایات کو بیان کروں اور ساتھ ہی اُن کے رفع کرنے کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالوں۔

سرحد پر باغی کیمپ کے بانی مبانی سید احمد تھے۔ وہ ان بیباک

ملہ ۔ آپ رائے بریلی کے رہنے والے تھے ۔ سنہ ۱۲۰۱ھ مطابق سنہ ۱۷۸۶ء کے متبرک مہینہ محرم میں پیدا ہوئے۔

اور باہمت نوجوانوں میں سے تھے جو نصف صدی قبل پنڈاری قوت کے استیصال کے بعد تمام ہندوستان میں بکھر گئے تھے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی اُس مشہور لٹیرے[1] کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے شروع کی جس نے مالوہ کے افیم پیدا کرنے والے دیہات کو دور تک تاخت و تاراج کیا تھا۔ مگر سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے جس سختی کے ساتھ اپنے مسلمان ہمسایوں کو دبائے رکھا اُس سے مسلمان لٹیروں کا کام بہت ہی خطرناک اور غیر منفعت بخش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمارا جو مذکور سے ہندو اور مذہبی تعصب نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے جوش و خروش کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا چنانچہ انہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر کے ۱۸۱۶ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لئے دہلی جاکر ایک جید عالم[2] کی شاگردی قبول کی۔ اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ حیثیت کے بعد ایک مبلغ کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے بزرگ طریقہ پر اُن بدعات کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانان ہند کے اسلامی عقائد میں داخل ہو چکی تھیں اور اس طرح پرجوش اور حوصلہ مند لوگوں

---

[1] امیر خاں پنڈاری نواب آف ٹانک۔ مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ ہر محب وطن اور آزادی خواہ کو پہلے لٹیرے ہی کے لقب سے یاد کرتی رہیں (مترجم)

[2] شاہ عبدالعزیز صاحب۔

کو اپنا مرید بنا لیا۔ اُن کی تبلیغ کا پہلا مرکز رُہیلوں کی قوم تھی جِن کو صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے لئے ہم نے محض دولت کے لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کو دے دی تھیں۔ اور جس کی افسوسناک تاریخ وارن ہیسٹنگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما داغ ہے۔ اُن کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اُس کا انتقام لیتی چلی آ رہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اُس کے بہترین شمشیر زن مُہیا کر رہی ہے رُہیلوں کے معاملہ میں بھی اور ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہم نے مظالم کئے ہیں ہم نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹا ہے۔
۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مرید اُن کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنٰے سے ادنٰے کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمت گاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھنے لگے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد اُن کے مُریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آ گئی۔ انھوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کئے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستے پر پڑتا ہو تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔

لہ۔ روہیلکھنڈ میں رام پور کے قریب فیض اللہ خاں کی جاگیر میں۔

اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے مقرر کیے[1] یعنی روحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اس کے لیے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت جاری کیا کرتے تھے۔ اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انہوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اس قدر ہجوم جمع ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا ان کے لیے مشکل تھا۔ بالآخر اُنہیں اپنی پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصہ کو چھُو لے گا اُن کا مرید ہو جائے گا۔ ۱۸۲۲ء میں وہ حج کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے اور اس طرح پر اپنی گذشتہ سوانح حیات کو جو بحیثیت ایک قزاق کے گذاری تھی حاجی[2] کے مقدس لباس میں چھپا کر اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی وارد ہوئے۔ یہاں پر بھی آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی۔ مگر اس لیٹرے ولی کے

---

[1] مولوی ولایت علی۔ مولوی عنایت علی۔ مولوی محرم علی اور مولوی فرحت حسین اور شاہ محمد حسین کو قاضی القضاۃ مقرر کیا [2] انگریز مصنفین ایسے ایسے ناپاک اور گمراہ کن الفاظ جگہ بہ جگہ موزون کر کے اپنی گندی ذہنیت کا ثبوت دینے کے عادی ہیں (مترجم)

لئے انگریزی علاقہ کے پُرامن شہریوں کے بجائے ایک اور زیادہ موزون میدان موجود تھا۔ انہوں نے شمالی ہند کو واپس ہوتے ہوئے اپنے وطن مالوف ضلع رائے بریلی میں بہت سے سرکشوں کو اپنا مرید بنا لیا[۱۵]۔ اور ۱۸۲۴ء میں سرحد پر پشاور کے وحشی اور پہاڑی قبیلوں میں آ نمودار ہوئے۔ یہاں انہوں نے سکھ سلطنت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی تبلیغ شروع کردی

پٹھانوں کے قبائل نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ اُن کی دعوت پر لبیک کہی۔ اسلامی قبائل میں جو زیادہ پُرجوش اور توہم پرست تھے وہ اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ اُن کو اپنے ہندو ہمسایوں کو لوٹنے کے لیئے ایک مذہبی بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ امام صاحب نے اُن لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ جو شخص غازی ہوگا وہ مال غنیمت سے مالامال ہو کر لوٹے گا اور جو میدان جنگ میں کام آئے گا وہ سیدھا جنت کو سدھارے گا اور شہادت کا درجہ پائے گا۔ انہوں نے کابل اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور جہاں کہیں بھی گئے ملک کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے۔ اُنہوں نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف قبیلوں میں اتحاد واتفاق پیدا کیا[۱۶]۔ انہوں نے

---

[۱۵] ان کو قاضی القضاۃ شاہ محمد حسین نے مرید کیا تھا۔ جو ہمیشہ آپ کو روپیہ اور رنگروٹوں سے مدد دیتا رہا۔

[۱۶] یوسف زئی اور بارک زئی آپ کے وفاداروں میں سے تھے۔ پنج تار کا نواب فتح خاں بھی اُن کے ساتھ مل گیا۔ بعد میں سوات کی طاقت ور ریاست بھی اُن کے ساتھ ہو گئی۔ انہوں نے اپنا اقتدار ریاست امب پر بھی پیدا کر لیا تھا۔ نواب ٹانک جو اُن کا گذشتہ لیڈر تھا۔ ہمیشہ روپے اور رنگروٹوں سے اُن کی مدد کرتا رہا۔

اُن کو لوٹ مار کا لالچ دیا۔ اور اُن کا دین یہ کہہ کر خرید لیا کہ میں تمام دنیا کے مشرکین یعنی سکھوں سے لے کر چینیوں تک کی بیخ کنی کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوا ہوں۔ اُنھوں نے کوہستان کے سمجھ دار سیاسی لیڈروں اور قبائل کے دُنیادار سرداروں کو ہمسایہ سکھ قوم کی بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کی طرف توجہ دلائی۔ راجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی پرانی نفرت و حقارت ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی۔ اس طرح پر مذہبی احکام کی کامیابی کے لئے راستہ صاف کرنے کے بعد اُنھوں نے خدا کے نام پر ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جس میں تمام سچے مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس عجیب و غریب دستاویز کو اس طرح شروع کیا گیا تھا:۔

"سکھ قوم نے مدت سے لاہور اور دیگر علاقوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اُن کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا ہے اور ہزاروں کو بے عزت اور بدنام کیا گیا ہے۔ انھوں نے مساجد میں اذان کا دینا بند کر رکھا ہے اور گاؤ کشی کی قطعی ممانعت کر دی ہے۔ آخر کار جب اُن کا ظلم و تعدی ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیا تو سید احمد علیہ الرحمۃ نے صرف اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کہ دین اسلام کی حفاظت کی جائے، اپنے ساتھ چند مخلص مسلمانوں کو لے کر کابل اور پشاور

کی راہ لی۔ اور وہاں پر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور اُن میں جُراءت و ہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہزاروں مسلمانوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہی اور خدا کے راستے میں قربان ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ پس ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہو جائے گا۔"[1]

اس اثنا میں امام صاحب کے قاصدوں نے اس اعلان کو شمالی ہندوستان کے اُن بڑے بڑے شہروں میں پہنچا دیا جہاں پر اُنہوں نے اپنے مرید بنائے ہوئے تھے۔ یہ اعلان اس رسالہ سے لیا گیا ہے جو صوبہ اودھ کے ایک دُور افتادہ مقام سے شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد سکھوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں کبھی ایک فریق غالب آیا اور کبھی دوسرے فریق کو فتح نصیب ہوئی۔ دونوں طرف سے بے تحاشا قتلِ عام کیا گیا۔ مسلمان مجاہدین اور ہندو سکھوں کے درمیان نفرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُن کا اظہار ضرب المثل اور مقامی روایات کی صورت میں ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی سرحدوں کو ایک ایسے قابل جرنیل کے ذریعہ مستحکم کر لیا تھا جو نپولین اعظم کی فوج کے منتشر ہونے کے بعد تمام دنیا میں پھیل گئے تھے۔ پشاور کے

---

[1] رسالہ ترغیب الجہاد یعنی مذہبی جنگ پر اُکسانا۔ اس کے مصنف قنوج کے ایک مولوی صاحب تھے
سرکاری روداد ۱۸۶۵ء

کسانوں کو ایک اطالوی قسمت کے مارے جرنیل ادیطابی (AVITALULI)[1]
کا نام اب تک یاد ہے۔ مسلمان وقتاً فوقتاً پہاڑوں سے نکل کر میدانوں پر
چھاپہ مارتے اور جہاں جاتے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ ان کے
مقابلہ میں گاؤں کے بہادر سکھ مسلح ہو کر ان کی مدافعت کرتے اور ان
کوہستانی جنگلوں کو اپنے پہاڑوں کی طرف بھگا دیتے پھر درندوں کی
طرح ان کا تعاقب کرتے۔ اس وقت کے انتہائی جوش و خروش نے
پٹھہ داری کی ایک نہایت ہی خوفناک صورت چھوڑی ہے یعنی پٹہ داری بہ
عوض خون، چنانچہ سرحد کے ہندو اب تک بڑے فخر کے ساتھ یہ بیان کرتے
ہیں کہ ان کے گاؤں کی اراضیات حسین خیل قبیلے کے ایک سو سر سالانہ
کی پٹہ داری پر دی گئی تھیں۔

باقاعدہ جنگوں میں مجاہدین کی بے ترتیب فوج سکھوں کی منظم سپاہ
کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ ۱۸۲۷ء کو امام صاحب نے اپنے قبائل کے ساتھ
ان کے ایک ایسے کیمپ پر حملہ کر دیا جس نے خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ
کر لیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کو سخت جانی نقصان کے بعد پسپا ہونا
پڑا۔ مگر میدانی جرنیل کو فتحمندانہ تعاقب کی جرأت نہ ہوئی اور یہ متعصب
گروہ دریائے سندھ کے پار اپنے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اس طرح سے

---

[1] میں نے اس جرنیل کا نام مقامی تلفظ کے مطابق دیا ہے

انہوں نے جنگ چاول میں فہمندی سے اپنا نام پیدا کر لیا یہاں تک کہ سکھ حاکم اس بات پر مجبور ہو گیا کہ اُن قبائل کی حمایت خرید لے جو چھاپہ مارنے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ سنہ ۱۸۲۹ء میں تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ میدان والوں کو پشاور شہر کے متعلق بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا جو سرحدی صوبہ کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں کے صوبہ دار[1] نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے دغابازی سے امام صاحب کو زہر دینے کی کوشش کی اس افواہ نے کوہستانی مسلمانوں کے جوش کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا۔ وہ نہایت ہی جوش خروش[2] سے میدانی علاقوں پر ٹوٹ پڑے اور کفار کی تمام افواج کو تہ تیغ اور اُس کے جرنیل کو مہلک طور پر زخمی کر دیا۔ صرف شہر پشاور ہی اُس فوج کی وجہ سے جو شہزادہ شیر سنگھ اور جرنیل ونچورا (Ventiue) کی ماتحتی میں تھی بچ سکا۔ اب امام صاحب کا احاطہ اقتدار بڑھتے بڑھتے کشمیر تک جا پہنچا تھا اور شمالی ہند کے غیر مطمئن شہزادوں کی فوج اُن کے کیمپ میں پہنچنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے جو سکھ ریاستوں کے وفاق کا سربراہ تھا ایک لشکر جرار اپنے قابل ترین جرنیلوں کی سرکردگی میں روانہ کیا جو اُن سنہ ۱۸۳۰ء میں شکست کھانے کے باوجود امام صاحب کی فوج نے بہت بڑی

---

[1] یہ ایک مسلمان تھا اور رنجیت سنگھ کا ایجنٹ تھا
[2] اُس فوج سے جو جرنیل ایلرڈ (ALDARD) اور ہری سنگھ نلوہ کی ماتحتی میں تھی۔

قوت کے ساتھ میدانی علاقہ پر قبضہ کر لیا اور اسی سال کے اختتام سے پہلے خود پشاور کو بھی جو پنجاب کا مغربی دارالسلطنت تھا فتح کر لیا تھا۔

یہ زمانہ امام صاحب کی زندگی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے خلیفہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے جن پر یہ عبارت کندہ تھی :-

"احمد العادل محافظ دین اسلام جس کی شمشیر کی چمک کافروں کے لئے پیغام اجل ہے"

پشاور کے چھن جانے کا غم رنجیت سنگھ کے بے نظیر سیاسی تدبر کو بروئے کار لایا۔ اس چالاک سکھ نے معمولی معمولی مسلمان ریاستوں کو ان کے اپنے مفاد کا واسطہ دے کر اسلامی فوج سے علیحدہ کرا دیا۔ اس صورت حالات کو دیکھ کر امام صاحب اس بات پر مجبور ہو گئے کہ فدیہ لے کر پشاور کو خالی کر دیں۔ ان کے مریدوں کی آپس میں لڑائی نے تمام نظم ونسق کو برباد کر دیا تھا۔ ان کی باقاعدہ منظم فوج ہندوستانی مذہبی مجنونوں پر مشتمل تھی جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے بھرتی کئے گئے تھے اور جنہوں نے ہر حالت میں خواہ وہ اچھی ہو یا بری ان کو اپنا راہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اور جن کے لئے اب ان کو چھوڑ جانا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ اس اسلامی فوج میں سرحد کے سرکش پٹھان بھی شامل ہو گئے تھے۔ جو اپنی بہادری کے

ساتھ ساتھ کوہستانی لوگوں کا تکبر اور لالچ بھی رکھتے تھے۔ ایک موقع پر تو ان سرحدی قبائل میں سے ایک نے عین لڑائی کے وقت غداری کی[1]۔ اور بعد میں ان مذہبی مجنونوں نے اس کا انتقام بہت ہی سخت لیا تھا امام صاحب نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کو بہت فیاضی سے کام لینا چاہیے کیونکہ وہ ہر وقت اُن پر اعتماد کر سکتے تھے چنانچہ سب سے پہلے تو اُن کی ضروریات کے لئے آمدنی کا دسواں حصہ وہ اپنے سرحدی مریدوں سے حاصل کرتے تھے۔ اور وہ اُس کو دین کی حفاظت کے لئے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر کچھ پس و پیش کے ساتھ ادا کرتے رہتے مگر جب فریقین میں اس قسم کے چندوں کی بنا پر مناقشت پیدا ہو گئی تو امام صاحب کے اقتدار میں فرق آنا شروع ہو گیا۔ کیونکہ اُن کا اصلی جوہر آتش بیانی تھا اور وہ اس قابل نہ تھے کہ مختلف گروہوں پر غیر جانبدارانہ حکومت کر سکیں اور وہ حیرت انگیز اقتدار جو آپ کو سرحدی قبائل پر حاصل ہُوا تھا اُس کے زائل ہونے کے آثار بہت جلد پیدا ہو گئے۔ جب اُن کو اپنی طاقت کے زائل ہونے کا خدشہ پیدا ہوا تو انہوں نے زیادہ سختی سے کام لینا شروع کر دیا اور آخر کار سرحدیوں کے نہایت ہی نازک جذبہ کو مجروح کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کے ورغلانے سے نہایت ہی غیر دانشمندانہ

---

[1] بارک زئی پٹھانوں نے سیدو کے مقام پر جب سکھوں سے لڑائی کی تھی۔

طور پر سرحدیوں کے شادی بیاہ کے رسم و رواج میں اصلاح شروع کردی۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی لڑکی کو اس شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو سب سے زیادہ بولی دیتا ہے۔ ان کے ہندوستانی مریدوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا اور بغیر بیویوں کے تھے اس لیے انہوں نے ایک حکم نافذ کر دیا کہ جو لڑکی بارہ دن کے اندر اندر بیاہی نہ جائے گی وہ اُن کے مریدوں کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اس پر سرحدی قبائل برافروختہ ہو گئے۔ اور انہوں نے سید صاحب کے ہندوستانی ساتھیوں کو قتل کر دیا اور خود انہوں نے بھاگ کر بڑی مشکل سے جان بچائی[۲] اب ان کا عہدِ حکومت ختم ہو چکا تھا اور سنہ ۱۸۳۱ء[۳] میں جبکہ وہ اپنے ایک نائب کی جس نے اپنے لئے ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی بطور ایک منسٹر امداد کر رہے

---

[۱] وادی پنج تار سے وادی پکھلی کو۔

[۲] مئی سنہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد صاحب کے مندرجہ بالا حالات میں نے دفتر پنجاب اور حکومت گورنمنٹ آف انڈیا کی دستاویزات اور سنہ ۱۸۵۲ء اور سنہ ۱۸۶۳ء کے شاہی مقدمات میں جو گواہیاں دی گئیں اور پٹنہ کے جج سر (T.E. REVSMSHAUD) کی ملفوظات سے حاصل کئے ہیں۔ آپ کے تفصیلی حالات کیپٹن (CUNNEGHAM.) کنگھم کی تاریخ سکھ سے مل سکتے ہیں۔ ایک اور مصنف نے جس نے شاید یہی مواد دیکھا ہے ایک بہت ہی اچھا مضمون وہابیوں کے متعلق کلکتہ ریویو CII CIC میں شائع کیا ہے۔

تھے سکھ فوج نے جو شہزادہ شیر سنگھ کے زیر کمان تھی ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔

اس تحریک کے مذہبی پہلو کے متعلق اس کتاب کے آخری باب میں بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان یا کسی اور ملک میں ایک مذہبی لیڈر انسانوں کے دلوں کو اس وقت تک نہیں گرما سکتا جب تک کہ وہ اپنی تحریک کی صداقت پر پورا پورا الیقین نہ رکھتا ہو۔ میں دوسرے باب میں سید احمد کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کر دوں گا۔ یہاں پر میں نے مجاہدین کی نوآبادی کے ابتدائی حالات ذرا تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس وقت تک کے واقعات کو مختصراً بیان کر دوں جب کہ وہ ہماری سرحد پر باغی کیمپ کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس امام کے معتمد نائبوں میں سے دو بھائی تھے جو ایک مشہور و معروف قاتل[۱] کے پوتے تھے جو اپنی جان کو بچانے کے لئے سندھ پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا اور وہاں ستیانا کے مقام پر بطور ایک عابد زاہد کے زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ اس پناہ گزیں درویش نے سرحدیوں میں اس قدر عزت حاصل کر لی تھی کہ وہ اس جگہ کو جہاں اس کی کٹیا تھی جائے پناہ اور غیر جانبدارانہ علاقہ تصور کرتے تھے۔ اس سے ان قبائل کے درمیان جو ہر وقت برسر پیکار رہتے تھے ایک بہترین صورت

---

[۱] زمان شاہ جو تخت بند بونیر کا رہنے والا تھا۔

حالات پیدا ہوگئی۔ اس درویش کے ایک پوتے نے جو امام[۱] کا خزانچی تھا ستیانا کے ماموں گاؤں میں اقتدار حاصل کرکے امام صاحب کی باقی ماندہ فوج کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

اسی زمانہ میں سوات کی ریاست کے مذہبی پیشوا نے انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہوکر مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ یہاں پر ایک مضبوط شاہی حکومت قائم کرلی جائے۔ اسی خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے درویش مذکور کے دوسرے پوتے[۲] کو سوات آنے کی دعوت دی اور اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اس طرح پر اس نے باشندوں کی فطرتی شجاعت کو قائم رکھا۔ کیونکہ اب ان کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ ہلالی فوج کے ایک مجاہد کے زیر کمان ہیں اور جو کوئی بھی اس متوقع جنگ میں جو انگریزوں یا ہندو کافروں سے ہونے والی ہے کام آئے گا وہ شہادت کا درجہ پائے گا لیکن سوات کے قبائل کے خطرات کبھی بھی شرمندہ معنی نہ ہوئے اور ان کے بادشاہ نے ۱۸۵۷ء تک حکومت کرکے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اس کے بعد ان کا کوئی جانشین منتخب نہ کیا گیا۔ فی زمانہ اس کا لڑکا اس خاندان کا سردار ہے اور ستیانا کی مجاہد آبادی کا لیڈر ہونے کا دعوے دار۔ وہ ریاست سوات کی حکومت پر بھی نظر رکھتا ہے۔

اس طرح پر ان مجاہدین نے سرحد پر دو پہلوؤں سے اپنے اقتدار کو مستحکم

۱؎ سید عمر شاہ ۲؎ سید اکبر شاہ۔

کرلیا تھا اور اپنے مبلغین کے ذریعے سرحد کے توہم پرست قبائل میں جہاد کی آگ ہمیشہ سلگائے رکھتے تھے۔ کچھ سالوں تک اُن کی حیثیت بے حقیقت سرحدی لیٹروں کی سی رہی جو کبھی کبھی ایک نہایت ہی خوفناک ہلالی فوج کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ہمارے الحاق پنجاب سے پہلے انہوں نے اپنے ہندو ہمسایوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا لامتناہی سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور اُس زمانہ میں مسلمانوں کی فوج میں بہت سے رنگروٹ خود ہمارے ہی علاقہ سے بھرتی ہونے گئے تھے اس متعصب نو آبادی کے لئے اپنی رعایا سے بھرتی روکنے کے لیے ہم نے کوئی تدابیر اختیار نہ کی تھیں۔ یہ فوج اپنا غصہ سکھوں پر نکالا کرتی تھی اور قبائل کے ناپائدار اتحاد پر مشتمل تھی جو کبھی ہمارے موافق اور کبھی ہمارے مخالف ہو جاتی تھی۔ ایک بہت بڑے انگریز تاجر نے جو ہمارے شمال مغربی صوبہ میں نیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا مجھے بتلایا کہ اُس کے بہت سے دیندار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معین حصہ ستیانا کیمپ کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے۔ اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لئے چلے جاتے تھے جس طرح کبھی کبھی اُس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے اُسی طرح اُس کے مسلمان ملازم جو نیل کی تجارتی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان اس

غدر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا تھا۔

اس غفلت کی وجہ سے ہماری رعایا کو اُس متعصب کیمپ میں ہمارے سکھ ہمسایوں کے خلاف بھرتی ہونے کی عام اجازت ہوگئی جس کا ہمیں بہت خمیازہ اٹھانا پڑا۔ امام[1] صاحب نے سکھوں کی سرحد پر اور ہمارے علاقہ میں باقاعدہ ایک گدّی قائم کرلی تھی اور اب یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ خود ان کی وفات کو بھی اُن کے پُرجوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدس ذریعہ بنالیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اُن کے دو خلفا نے جن کو اُنہوں نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا زیارت کے لئے سرحد کا سفر اختیار کیا اور پورے طور پر معلوم کرلیا کہ اُن کے امام صاحب معجزانہ طور پر غائب ہوگئے ہیں اگرچہ وہ ابھی تک بقید حیات موجود ہیں۔ اور وہ وقت مقررہ پر اپنے آپ کو ایک جہادی فوج کے قائد کی حیثیت سے ظاہر کرینگے۔ اور انگریز کافروں کو ہندوستان سے نکال باہر کرینگے۔ اس لئے اُن کے خلفاء نے دریائے

---

[1] امام صاحب کا لفظ جہاں کہیں بھی آئیگا اُس سے میری مراد سید احمد صاحب ہیں۔ حقیقت میں وہ سیاسی اعتبار سے امام تھے اور شرعی لحاظ سے ایک ولی۔ اصلیت یہ ہے کہ حضرت مسیح اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔

گنگا کی وادی کے ساتھ ساتھ اُن تمام بڑے بڑے شہروں میں جہاں پر امام صاحب نے اپنے سفر کلکتہ ۲۱-۱۸۲۰ء کے دوران میں تبلیغ کی تھی روپیہ اور آدمی جمع کرنے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا بالخصوص روپے کی فراہمی کا۔ اس طرح ہمارے ملک سے نکل کر متعصب تو آبادی تک غیر مطمئن لوگوں کے جانے کا ایک دائمی تانتا بندھ گیا۔ بھگوڑے، مقروض، فرار شدہ قیدی، ہر وہ فضول خرچ جو اس قدر برباد ہو چکا تھا کہ اپنوں میں رہنا اُس کے لئے دشوار تھا اور غدار جس کے نئے قانون کی رو سے بچنا محال تھا تمام کے تمام انگریزی علاقے سے بھاگ کر سرحد پر جمع ہو جاتے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں پر اعلیٰ طبقہ کے پناہ گزیں بھی تھے اور ہر وہ دیندار مسلمان جس کو عیسائی حکومت کے ماتحت آرام سے زندگی بسر کرنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ اگر ہمت باندھ لیتا تو ستھانا کیمپ کی طرف چل دیتا۔ وہ سکھوں کے گاؤں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور اس بات پر بھی خوش ہوتے تھے کہ اُن کو انگریز کافروں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جنگ کابل میں انھوں نے ایک لشکر جرار ہمارے دشمن کی امداد کے لئے روانہ کیا اور ایک ہزار کے قریب آخر دم تک ہمارا مقابلہ کرتے رہے۔ صرف فتح غزنی کے موقع پر تین سو کے قریب نے انگریزی تلواروں کے ذریعے جام شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

جب ہم نے پنجاب کا الحاق کیا تو تعصب کی اس رَو کا رخ جو پہلے سکھوں

کی طرف ہوتا تھا اب اُن کے جانشینوں کی طرف پھر گیا۔ ستیانا فوج کی نظر میں انگریز اور ہندو دونوں کافر تھے۔ اور اس لئے اِس قابل تھے کہ تلوار کے ذریعہ اُن کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ سکھوں کی سرحد پر جس بد امنی سے ہم نے چشم پوشی کی تھی یا جس سے بے پروائی کی تھی وہ ایک تکلیف دہ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچی۔

پٹنہ کی عدالت کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے خلفا[1] نے مذہبی آتش بیانیوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سر ہنری لارنس کو گواہیوں[2] کے دوران میں معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں مجاہدین[3] کے نام سے موسوم تھے اور اسی حیثیت سے محافظوں کے درمیان اُن کو اُن کے وطن پٹنہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

یہاں مجسٹریٹ نے اُن سے اور اُن کی جماعت کے دو اور دانشمند ممبروں سے آئندہ نیک چلنی کی ضمانت لے لی۔ لیکن ۱۸۵۱ء میں وہ پھر جنوبی بنگال کے راجشاہی ضلع میں بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے اور وہاں بھی اُن سے امن قائم رکھنے کے لئے مچلکہ لے لیا گیا[4]۔ مگر اس جرم کا پھر

---

[1] عنایت علی اور ولایت علی

[2] مجسٹریٹ کے ریکارڈ ۱۲ اپریل ۱۸۴۷ء

[3] غازی یا جہادی۔ ان کا نام وہابی بعد میں رکھا گیا تھا جس کی تشریح دوسرے باب میں آئے گی۔

[4] مجسٹریٹ راجشاہی کی عدالت میں بیانات ۲۳ فروری ۱۸۵۱ء

اعادہ کرنے پر دو دفعہ اُن کو اس ضلع سے خارج کیا گیا۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں بھی دونوں خلفا باوجودیکہ وہ مچلکہ اور ضمانت کی بنا پر جہاں تک کہ کاغذی مچلکہ اور ضمانت ان کو پابند کر سکتے ہیں اپنے گھر پٹنہ میں رہنے کے لئے مجبور تھے۔ پھر بھی پنجاب کی سرحد پر بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے۔[1]

سنہ ۱۸۵۲ء کو انہوں نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آگیا ہے۔ روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستیانا کیمپ کو متواتر جارہے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑلی تھی یعنی انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اُس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور منصب نوآبادی کے بہت ہی قریب تھی اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ ان خطوط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ انہی دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس انگریزی صوبہ کے دارالخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی اعلانیہ تبلیغ کر رہے تھے

---

[1] ریونیو بورڈ کی مثل ۱۲ر مئی سنہ ۱۸۵۱ء

پولیس بھی ان ہی دیوانوں کی طرفدار تھی اور اُن کے لیڈروں میں سے ایک نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اس غرض کے لیے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلہ کی کوئی مزید تفتیش ہوئی تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا اُس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھیں بند نہ کر سکتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۲ء کے موسم خزاں میں اس موضوع پر دو اہم یادداشتیں تحریر کیں۔ پہلی یادداشت میں لارڈ موصوف نے یہ حکم فرمایا تھا کہ اندرون ملک میں اس نظام کی پورے طور پر نگرانی کی جائے اور دوسری یادداشت میں اُن قبائل کے ساتھ ایک سرحدی جنگ کی موزونیت پر بحث کی گئی تھی جن کی کافروں کے ساتھ توہم پرستانہ نفرت کی آگ کو ہندوستانی دیوانوں نے ہوا دے کر خوب ہی بھڑکا دیا تھا۔ اسی سال انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران

میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد چھتیس ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی بیس (۲۰) تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثنا میں ستھانا کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد[1] کی بنا ڈالی اور یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ انگریزی حاکموں سے بھی تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ چنانچہ ہمارے انکار پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹننٹ ہورن (LIEUT HORN) کے کیمپ پر شبخون مارا جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے اب زیادہ دیر نہ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سر سڈنی کوٹن (SIR SIDNEY COTTON) پانچ ہزار فوج[2] کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گیا۔

---

[1] خاص طور پر یوسف زئی اور پنج تار کے قبیلے

[2] توپ خانہ ۲۱۹، سوار ۱۰۵۰، پیدل ۳۱۵۰، کل ۵۰۰۰ باقاعدہ فوج

چونکہ یہ جنگ ان جنگوں میں سب سے پہلی تھی جو اس جنوبی کیمپ کی وجہ سے
نہیں لڑنی پڑیں اس لئے میں اس کو یہیں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ اور
دوسری لڑائی کو جو ۱۸۵۸ء میں ہوئی صرف بطور مثال پیش کروں گا۔ کسی
قدر وقت کے بعد جنرل سر سڈنی کاٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں
کو جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار اور ستھانا کی باغی نو
آبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ مہابن پہاڑیوں
کی دشوار گزار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور ان کی قوت کو ذرا بھر بھی ضعف
نہ پہنچنے پایا کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر انہیں ایک نو آبادی
قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

انگریزی حکومت کے علاوہ مجاہدین کے کیمپ کے اور بھی دشمن تھے
گاہے بگاہے انہوں نے اپنی دینی حکومت کی زیادتی کی وجہ سے ارد گرد کے
پہاڑی علاقہ سے بھی آمدنی کا عشر وصول کرنے کی کوشش کی۔ یہ ٹیکس مبلغ کے شخصی
اقتدار کے مطابق جس کے سپرد ٹیکس جمع کرنے کا کام بھی ہوتا تھا کبھی ادا کر دیا جاتا
کبھی اس سے اغماض برتا جاتا اور کبھی بالکل ہی انکار کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح
کوہستانی قبائل میں خلفشار کی حالت ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ ہم پہلے بیان کر
چکے ہیں کہ کس طرح وہ امام صاحب سے دل برداشتہ ہوگئے تھے جس کی وجہ سے
انہوں نے ان سے علیحدگی اختیار کی اور جس کی بنا پر آخر کار ۱۸۳۱ء میں ان کی

موت واقع ہوئی۔ جب کوئی قبیلہ عشر دینے سے انکار کر دیتا تھا تو مجاہدین سارے کے سارے اُن پر ہلہ بول دیتے تھے اور انکار کرنے والی فصلوں کو کاٹ کر غلہ اُٹھالے جاتے تھے ۱۸۵۸ء میں قبیلوں نے اس مذہبی ٹیکس کی مخالفت کی بنا پر سیتانا پر حملہ کر کے اُس کے لیڈر کو قتل کر دیا تھا۔[۱]

یہ باغی کیمپ سرسڈنی کوٹن کی مہم اور اُن کے طرفداروں کی علیحدگی سے کمزور ہو گیا تھا اور اس وجہ سے دو سال تک بالکل خاموش رہا۔ ہم نے سیتانا کے علاقہ کو اس ہمسایہ قبیلہ[۲] کے سپرد کر دیا جس نے عشر دینے کی مخالفت کی تھی اور مجاہدین کے امیر کو قتل کر دیا تھا۔ اس قبیلے اور ایک دوسرے طاقتور قبیلہ[۳] سے ہم نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقہ میں گھسنے نہ دیں گے اور وہ اس تیسری قوم کی بھی مخالفت کریں گے جو ان کو اس علاقہ میں لانے کے لئے اُن کی ممد و معاون ہوگی نیز مجاہدین اور دوسرے شریر لوگوں کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے تاکہ وہ برطانوی علاقہ میں داخل ہو کر قتل و غارت برپا نہ کرنے پائیں۔

مگر ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ باغی نو آبادی نے ازسر نو توہم پرست سرحدی قبائل میں پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں ملکا سے جو پہاڑوں

---

[۱] سید عمر شاہ صاحب کو آتمان زئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔

[۲] آتمان زئی [۳] جادون

کے اندر اُن کی جائے پناہ تھی جہاں پر حملہ کر دیا۔ جہاں سے ۱۸۵۸ء میں سر سڈنی کوٹن نے اُن کو بھگا دیا تھا اور مین سیتانا کی پرانی آبادی کے اوپر قلعہ بند ہوگئے[1]۔ اس مضبوط قلعے سے نکل کر وہ ہمارے گاؤں پر چھاپہ مارتے تھے اور انھی قوموں نے جنھوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے۔ ان کو لوٹ مار کی غرض سے اپنے علاقہ سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس امر کا گویا بانگِ دہل اعلان کرنے لگے کہ پرانی حالت پھر قائم ہوگئی ہے مجاہدین راولپنڈی کے ضلع میں گھس آئے اور دن دہاڑے شاہراہ عام پر پولیس کی چوکی سے[2] تھوڑے ہی فاصلہ پر دو تاجروں کو قتل کر دیا۔ اس کے تین ہفتہ بعد انھوں نے ہمارے علاقہ پر پھر چھاپہ مارا اور تین دولتمند آدمیوں کو اٹھا لے گئے اور بعد میں نہایت متانت کے ساتھ ہمارے افسروں سے خط و کتابت شروع کر دی جس میں ان قیدیوں کے آزاد کرنے کے لئے ایک ہزار پانچسو پچاس روپے فدیہ طلب کیا گیا۔ اس روپے کا نصف مجاہدین کے امیر کو پہنچتا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۸۶۱ء میں اغوا کی ایک اور واردات ہوئی۔ سرحد کی حکومت نے رپورٹ دی کہ اپریل ۱۸۶۲ء کے خطرناک حالات پھر پیدا ہوگئے ہیں۔ انگریز افسروں نے

---

[1] سری کے مقام پر۔ (Siri)

[2] ۱۴ر فروری ۱۸۶۱ء

اپنے حیف قبائل کو اُن کے دین اور اُن کی تکالیف کا بے فائدہ واسطہ دیا
اور باوجودیکہ اُن کے بہت سے گاؤں ہمارے رحم و کرم پر تھے لیکن پھر
بھی انہوں نے اپنے ہم مذہبوں ہی کا ساتھ دیا۔ اب ہمارے پاس سوائے
بدلہ کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ اس لئے ہم نے ان قوموں کا محاصرہ
کر کے باقی دنیا سے ان کا تعلق منقطع کر دیا اور ہر اُس شخص کو گرفتار کر لیا
جس نے سرحد عبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سے اُن کی عقل ٹھکانے
لگ گئی اور اُنہوں نے پھر ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا اور باغی آبادی کو
ستیانا کے علاقہ سے مُلکا کی اندرونی وادیوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

تاہم ہماری سب دفاہند و ستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی
رہی ۱۸۶۲ء میں اُن کی تعداد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک
دوسری جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ حقیقتاً اب حالات اس حد تک
پہنچ گئے تھے کہ وزیر ہند نے اپنے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ ان باغیوں
کو جلد یا بدیر یہاں سے فوجی قوت کے ذریعہ نکال باہر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ
جب تک یہ سرحد پر مقیم رہیں گے اُس وقت تک یہ ہمارے لئے ہمیشہ
ہی خطرہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

بہر حال اس وقت مہم کا روانہ کرنا ناممکن تھا۔ اپریل ۱۸۶۳ء کے
اوائل میں اُنہوں نے ہمارے علاقے میں پھر قتل و غارت اور لوٹ مار

کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اسی سال ماہ جولائی میں وہ نہایت دلیری کے ساتھ ستیانا کے علاقہ پر پھر قابض ہو گئے اور ہمارے حلیف ریاست امب کے نوابصاحب کو تہدید آمیز خطوط لکھے۔ اُن کی ہمسایہ اقوام نے ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کو اپنے تعصب پر قربان کر دیا اور اُن مواعید کو جو ہمارے ساتھ کئے گئے تھے بالکل فراموش کر دیا۔ چنانچہ اس باغی آبادی کو سرحد پر ایک دفعہ پھر حاکمانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ دسمبر ۱۸۶۳ء کو وہ برطانوی علاقہ پر چڑھ دوڑے اور ہماری طلایہ گرد فوج کے کیمپ پر شبخون مار کر گویا باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر بھی حملہ کر کے کوہ سیاہ پران کے دیہات کو جلا دیا اور سرحدی چوکیوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ اسی مہینے میں انہوں نے تناول کی حلیف تحصیلوں پر بھی چھاپہ مارا اور ایک ملکی افسر کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ قتل کر ڈالا۔

پھر ہمارے دوستوں پر ہی حملہ کرنے پر اکتفانہ کرتے ہوئے انہوں نے دریائے سندھ کے کنارے ہماری چوکی پر بھی ہلہ بول دیا۔ انگریز کافروں کے خلاف ایک باقاعدہ اعلان جنگ شائع کیا اور ہر دیندار مسلمان کو اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔

اب ہم تقریباً انہی حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۶ء و ۱۸۳۱ء کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور جس کے نتیجہ پر اس متعصب لشکر نے پنجاب پر

اپنا تصرف جما لیا تھا۔ یہاں تک کہ سرحدی دارالخلافہ ان کے قبضہ میں آگیا۔ اب جنگ سے گریز کرنا بالکل ناممکن ہوگیا تھا لیکن سرحدی لڑائیوں سے کوئی فوجی سبق حاصل نہیں ہوتا اور نہ کسی طاقتور سلطنت کی عزت میں کوئی نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی جنگ کے نتیجہ میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی جو برطانوی ہندوستان جیسی فوجی طاقت اور غیر مہذب اقوام کے اتحادیوں کے درمیان ہو خواہ وہ کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں اور اُن میں دینی حرارت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ مزید براں ان لڑائیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور بے شک ان کا انجام ایک سخت انتقام کی صورت میں رونما ہوتا ہے جو ایک سنجیدہ انسان کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن ہوگا۔ اس متعصب آبادی کے خلاف اُن چار مہموں میں سے ایک مہم کو بہ تفصیل بیان کرنے کے لئے منتخب کر لوں گا۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح باغی کیمپ امن کے زمانہ میں ہماری سرحد پر ہمارے لئے باعث توہین تھا اُس سے کہیں زیادہ جنگ کے زمانہ میں ہماری فوج کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ جب تک ہم نے اُن سے بازپرس نہ کی وہ ہمارے دوستوں اور ہماری رعایا کو قتل اور اغوا کرنے کے لئے گرد و پرگردہ بھیجتے رہے اور جب ہم نے اُن کو فوجی قوت کے ساتھ صفحۂ ہستی سے نابود کر دینا چاہا تو انہوں نے ہمارے افسروں کو دھوکے میں رکھا اور ہماری فوج کو سخت نقصان پہنچایا اور کچھ عرصہ تک سارے

برطانوی ہندوستان کی سرحدی فوج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔

اس سے یہ سمجھ لینا نہایت آسان ہوگا کہ کس طرح باغیوں اور پناہ گزینوں کی آبادی نے جس کے پشت پناہ ہماری ہی سلطنت کے سازشی اور متعصب لوگ تھے نفرت و حقارت سے مغلوب ہو کر خود ہم کو ہی کھلم کھلا چیلنج دے دیا تھا۔ لیکن اس بات کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کس طرح ایک منظم فوج کی قوت اور جنگی قابلیت کا مقابلہ کر سکتے تھے خواہ وہ تھوڑے ہی وقت کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُس مُلک کے مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں جس میں اُن کے امام صاحب نے اس جنگ جو جماعت کا مرکز قائم کیا تھا۔

وادیٔ سندھ کے عین شمال میں اُس سرحدی قبیلے کی حد پر جو برطانوی تاج کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے ہیں کوہ ہند کی مقدس پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان آریاؤں پر جنہوں نے پہلے پہل جنوب کی طرف سفر اختیار کیا تھا مہابن جس کا ترجمہ ہے بہت بڑا جنگل کے سوائے اور کسی قدرتی رکاوٹ نے اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اُنہوں نے اس پہاڑ کا نام بھی یہی تجویز کیا تھا اور اُن تمام جنگلوں اور پہاڑوں کو جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی تک چھائے ہوئے ہیں اب تک مہابن یعنی بہت بڑا جنگل ہی کہا جاتا ہے۔ اُس قوم کے نزدیک ان

پہاڑوں کو وہی حیثیت حاصل تھی جو یہودیوں کے نزدیک وادی سینا کو حاصل ہے۔ اور سنسکرت کے گیتوں سے ابتدائی ایام کی اس پرستش کو بقائے دوام حاصل ہو گیا ہے۔ مدت مدید تک دیندار ہندو کے لئے مہابن تیرتھ بنا رہا۔ یہی وہ متبرک پہاڑیاں تھیں جن پر ارجن نے تن تنہا ایک بہت بڑے دیوتا سے جنگ کی تھی[۱] اور اگرچہ زمانہ قدیم کے حضرت یعقوبؑ کی طرح شکست کھائی تھی لیکن اُس دیوتا سے ایک ایسا ہتھیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ زمانہ قدیم میں وہ سنیاسی بہت ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا جو ان پہاڑیوں کے تلے جان دے دیتا تھا۔ اور جیسا کہ قدیم روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ معمولی معمولی دیوتاؤں کو بھی یہاں پر برت رکھنے پڑتے اور ریاضت کرنی پڑتی تھی تاکہ تزکیہ باطنی کر کے روحانی ترقی حاصل کر سکیں[۲]۔

قدیم ہندوؤں کے اس مقدس علاقہ میں اب توہم پرست مسلمان قبائل آباد ہو گئے ہیں۔ کوہ سیاہ پر دریائے سندھ کے مشرق کی طرف بھی ایسی ہی متشدد اور متعصب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ اور ایبٹ آباد کی سرحدی انگریزی چوکی کو ہر وقت اُن کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ آمدنی کا عشر اور دیگر مذہبی چندے ایسے امور ہیں جو اس متعصب آبادی کے ساتھ دیگر اقوام کا دیرپا اتحاد پیدا کرتے

---

[۱] مہابھارت۔
[۲] اس میں میں نے اپنے اُس مضمون سے استفادہ کیا ہے جو میں نے سات سال پہلے کلکتہ کوارٹرلی ریویو میں لکھا تھا۔

میں رکاوٹ ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان قبائل میں مذہبی جوش کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے اور ہماری سرحد کے اندر ہندوؤں کے دولتمند دیہات کو لوٹنے کا موقعہ اُن کے لئے ہمیشہ بڑی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ صرف سوات ہی کی مذہبی ریاست میں ۹۶۰۰۰ ہزار کی آبادی ہے اور اُن میں سے ہر ایک کے ذہن میں پشتہا پشت سے انگریزی حملہ کے خطرات ڈالے جا رہے ہیں اور یہ ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ اگر اُن کافروں سے لڑنا ہی پڑے تو بہتر ہے کہ ایک مذہبی لیڈر کے جھنڈے تلے لڑا جائے تاکہ وہ لوگ جو میدان جنگ میں کام آئیں شہادت کا درجہ پائیں۔

۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ ایک مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کر دینا دنیا کے[لہ] ۵۳۰۰۰ ہزار جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ ملک کے دشوار گزار ہونے کی وجہ سے ہمارے سرحدی افسر قبائل کے مزاج اور اُن کے آپس کے تعلقات کے متعلق اکثر ... رہتے ہیں اور جب کبھی ان باغیوں

لہ میں یہاں پر علیحدہ علیحدہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ایک قبیلہ بغیر کسی تکلیف کے کتنے آدمی میدان جنگ میں لا سکتا ہے حسین زئی ۲۰۰۰ آکازئی ۱۰۰۰ ومنکازئی ۶۰۰۰ مدک خیل ۴۰۰۰ آمازئی ۱۵۰۰ جادون ۴۰۰۰ خدا خیل ۲۰۰ غیری ۱۲۰۰ باجوڑ ۳۰۰۰ رانی زئی ۲۰۰۰ دیر قبیلہ ۶۰۰۰ سوات کے قبیلے ۱۰۰۰۰ مجموعہ ۵۳۵۰۰ یہ اعداد وشمار میں نے دفتر خارجہ سے حاصل کئے ہیں اور جہاں تک ہو سکا کرنل میکر یگر (MAGRAGOR) سے اصلاح کرالی ہے۔ اس وقت ڈرانیڈر گیبزیٹر میں مشغول ہیں ۱۸۶۲ء میں ایک موقع پر ہمارے خلاف ... جنگ جوؤں کی تعداد ۶۰۰۰۰ ہزار ہو گئی تھی۔

کو شکست ہوتی ہے تو وہ صرف مہابن کے اندر دشوار گزار دروں میں چلے جاتے ہیں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ۷[1] ہزار برطانوی فوج نے سر نیول چیمبرلین کی سرکردگی میں کوچ کیا۔[2] اُن کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا اور ۴ ہزار خچر اور باربرداری کے دیگر جانور جن کو جمع کرنے کے لیے پنجاب کا کونہ کونہ چھان مارا تھا اُن کے

---

[1] باقاعدہ پیدل فوج ۴۵۰۰۔ باقاعدہ سوار ۲۰۰۔ توپخانہ ۲۸۰۔ ۱۰۰۰۰ سے زیادہ بے قاعدہ فوج جو سول کمشنر کے ماتحت تھی اور ۱۲ توپیں

[2] دربند کے مقام پر ۳۵۰ یورپین پیدل فوج۔ ۲۵۰ ہندوستانی پیدل اور ۲ توپیں تربیلا کے مقام پر ہندوستانی سواروں کا ایک سکواڈرن اور مختلف ہندوستانی فوج۔ ٹوپی کے مقام پر ۱۵۰ ہندوستانی سوار۔ ۲۵۰ پیادے اور ۲ توپیں۔ ایبٹ آباد میں ہائی لینڈرز کی ایک کمپنی۔ ۵ گورکھا اور ایک پنجابی پیادہ فوج کا صدر مقام۔ ۵۰ ہندوستانی سوار اور ۳ توپیں رستم بازار میں۔ ۲۰۰ ہندوستانی سوار مختلف ہندوستانی پیادے اور مردان گائڈ کور کا صدر مقام پشاور کے مقام پر مختلف توپخانہ کے علاوہ ہسار کی ایک رجمنٹ، یورپین پیادوں کی ایک رجمنٹ، بنگالی سواروں کی ۲ رجمنٹ اور ہندوستانی پیادوں کی ۳ رجمنٹ موجود تھیں۔ اخیر میں بیان کردہ رجمنٹ میں تجربہ کار سپاہی بہت کم تھے۔ اور اُن کا کام یہ تھا کہ سرحدی چوکیوں پر قابض رہیں اور اس کے لئے ایک رجمنٹ ضروری تھی۔ راولپنڈی کے مقام پر ہندوستانی پیادوں کی ایک رجمنٹ تھی۔ جن میں ۲۰۰ آدمی تھے۔ توپ خانہ کی ایک بیٹری ۹۳ ہائی لینڈر کی ایک کمپنی اور ۱۵ اور ۱۰۱ کا صدر مقام کوہاٹ میں ۸ توپیں۔ ہندوستانی سواروں کے ۲ سکواڈرن پنجابی پیادوں کی ایک رجمنٹ مگر کمزور تھی۔ بنوں میں ۶ توپیں ایک پنجابی پیادوں کی رجمنٹ موجود تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں ۲ توپیں۔ ایک پنجابی سواروں کی رجمنٹ اور ایک پنجابی پیادوں کی رجمنٹ تھی۔

ساتھ تھے - دوسرے دن شام کو ایک کالم تمام رات کوچ کرتا ہوا ایک ایسی گھاٹی پر جا پہنچا جس پر بہت سی جھاڑیاں تھیں اور بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور جو زیادہ تکلیف دہ طور پر درہ امبیلا کے نام سے مشہور ہے - ہمارے جنگی مرکز کی حفاظت کے لئے کافی فوج موجود رہتی تھی - اور اُس کے پیچھے سرحدی مقامات میں بھی طاقتور مورچہ بندی کی گئی تھی جس میں پیادہ اور سوار فوج اور کافی توپخانہ موجود تھا - یہ کچھ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ حملہ آور فوج کی پشت پر اتنی امداد موجود تھی کیونکہ ۲۰ تاریخ تک جرنیل کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ قبائل جن کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا اب متذبذب حالت میں ہیں اور اُس کے دو ہی دن بعد اُس نے گورنمنٹ کو تار دے دیا کہ فوج کو مجبوراً رُکنا پڑا ہے - ۲۳ تاریخ کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کیا اور بونیر والوں نے ہماری طلایہ گرد پارٹی پر حملہ کر دیا - اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سوات کا روحانی پیشوا[1] بھی ہمارے دشمنوں کے ساتھ جا ملا - اس اثنا میں گورنمنٹ کو سرحد سے تار پر تار چلے آتے رہے - جس میں مزید اور مزید بر مزید فوج بھیجنے کی التجا کی جاتی تھی - فیروزپور رجمنٹ کے ایک حصہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا گیا اور ایک اور رجمنٹ کو پشاور سے مغرب کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا - ۹۳ ہائی لینڈر سیالکوٹ سے اور ۲۳ اور ۲۴ ہندوستانی پیدل فوج لاہور سے یلغار کرتی ہوئی آ گئے

---

[1] عبد الغفور ایک درویش صفت آدمی ہے جس نے یوسف زئی قبیلہ پر توہم پرستانہ اور حیرت انگیز اثر جما رکھا ہے اور تمام پٹھان قبیلے اُس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں -

بڑھی ۔ ابھی تین ہفتے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ پنجاب کے قلعے یہاں تک خالی ہو گئے کہ میانمیر کے کمانڈ افسر کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ پنجاب کے گورنر کے لئے ۲۴ فوجیوں کی گارد کا انتظام کر سکے ۔

اس اثناء میں قبائلی لشکر ہماری قلیل فوج کے قریب تر ہوتا چلا گیا ۔ اب آگے بڑھنا تو بالکل ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست کھا جانے سے بھی بدتر ۔ ہماری اس حالت نے قبائلی لشکر کو جس کے افراد بچپن سے ہی پہاڑی جنگوں میں ماہر ہو جاتے ہیں بہت ہی فائدہ میں رکھا اور ایک افسر کی یادداشت سے مندرجہ ذیل اقتباس بخوبی ظاہر کر دے گا کہ ہماری فوج کیسے کیسے خطرات سے گھری ہوئی تھی ۔

"۲۰ تاریخ کو ہم اپنے بکھرے ہوئے گروہ کو بلا کر واپس ہوئے ۔ اور کیمپ پہنچنے تک برابر لڑتے رہے ۔ یہاں ہم کافی رات گئے پہنچے ۔ دشمن کافی تعداد میں تھے انہوں نے ہماری فوج کو چیرنے کی بھی کوشش کی ۔ مگر اب ہر شخص اُن کے مقابلے کے لئے تیار تھا ۔ اُن کا استقبال ہماری قطاروں سے بندوق کی گولیوں اور پہاڑوں پر چڑھائی ہوئی توپوں کے گولوں سے کیا گیا ۔ یہ شبخون عجیب شاندار نظارہ پیش کر رہا ہے جنگل کا سیاہ منظر سامنے ہے اور دائیں اور بائیں پہاڑوں پر جلائی ہوئی آگ ستاروں کی طرح چمک رہی ہے ۔ اُن کے درمیان وادی میں پیادہ فوج کی دُھندلی سی لکیر نظر آ رہی ہے ۔ اچانک اللہ اللہ کے خوفناک نعرے بلند ہوئے اور درختوں کے سائے میں سے بندوقیں چلتی اور کھڑکتی رہیں ۔ وہاں

چلتی تلواروں کی جھنکار ہے اور سیاہی مائل شکلوں کا ایک جم غفیر کھلے میدان میں سے دوڑتا ہوا ہماری صفوں کے بالکل قریب آکر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد چمک پیدا ہوئی اور ساتھ ہی اُس کے گرج، چھرے اور کنستر پتھروں اور سنگریزوں سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے ہیں۔ پتوں کے درمیان بڑبڑانے کی آواز آتی ہے۔ قطاروں سے ایک دم بندوقیں چلنے کی چمکار سے تمام جگہ روشن ہو جاتی ہے۔ اور جونہی ان کا دھواں دور ہوتا ہے حملہ آوروں کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ میدان جنگ سے چیخ و پکار کی دھیمی آواز اور کسی پٹھانی زبان میں پانی مانگنے کی صدا سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری بندوقوں کی باڑ کچھ اثر ضرور پیدا کر گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسری طرف سے ایک دو گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ پہاڑوں پر سے لڑھکتے ہوئے پتھروں کی آواز ہمارے دیسی سپاہیوں کے تیز کانوں کو یہ خبر دے دیتی ہے کہ دشمن اب ہمارے پہلو بہ پہلو حملہ کیا چاہتا ہے اور وہ اُن کے مقابلے کے لئے اسی وقت اس طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس طرح پرشعلوں کی روشنی اور رائفلوں کے چلنے کی آواز اندھیری رات میں بے آب و گیاہ پہاڑوں پر دُور دُور تک پہنچ جاتی ہے اور جنگ کے شور و غوغا سے جو پہاڑوں کی صدائے بازگشت سے سوگنا ہو جاتا ہے تمام وادی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پُر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر نعرے لگتے ہیں اور حملہ ہوتا ہے اور چھروں اور کارتوسوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ

بھی ایسا ہوتا ہے جیسا پہلے ہوا تھا۔ مگر اس دفعہ جو سیاہ گروہ ہماری صفوں کی طرف آہستہ آہستہ آرہا ہے ایک بھاری بوجھ کو نہایت احتیاط سے اُٹھائے ہوئے ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ "اُن" کی نشانہ بازی بھی خالی نہیں گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد صفوں کے درمیان سے ایک آواز تحکمانہ انداز میں سنائی دیتی ہے اور ہر شخص اُس کے لئے گوش بر آواز ہو جاتا ہے تاکہ حکم بجا لائے۔ حکم یہ ہے گولی چلانا بند کر دو۔ اُن کو سنگینوں کے فاصلے تک حملہ آور ہونے دو اور پھر ـــــ بعد کے الفاظ سنائی نہیں دیتے لیکن ہر ایک سپاہی جانتا ہے کہ یہ جملہ کس طرح ختم ہوا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کو روک لیتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ جو اس سے پہلے کے شور و غوغا کے ساتھ عجیب قسم کا مقابلہ پیش کرتی ہے اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ عین سامنے پہاڑ کی چوٹی پر قد آور جرنیل دکھائی دیتا ہے جو اپنے عملے سے اُونچا نظر آتا ہے اور نہایت غور کے ساتھ اپنے سامنے اندھیرے میں دیکھ رہا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے لیکن کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ دشمن جس کی تعداد کے متعلق ہم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے ابھی تک ہمارے سامنے والے جنگل میں موجود ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اب اُن کے پاؤں کی آہٹ بخوبی سُن سکتے ہیں اور اُن کے واپس جانے سے پتھر پہاڑوں پر سے گرتے ہیں اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وہ اپنے مجروحین اور مقتولین کو جلدی

جلدی اُٹھائے جا رہے ہیں ورنہ وہ بہت خاموشی کے ساتھ واپس ہوتے ایک ایک دن کی دیر دشمنوں کے تعصبی جوش۔ اُن کی طاقت اور اُمیدوں کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنیل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک برطانوی سپاہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر کے مارے ورے ہیں دبکی پڑی ہے اور وادی چمالہ میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ جہاں باجور قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس طرح ہماری فوج کا ہراول میسرہ اور رسد کی آمد و رفت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ ۸ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے نہایت بے صبری کے ساتھ پوچھا کہ جرنیل صاحب کو ۶۰۰۰ پیادہ فوج کی کمک بہم پہنچائی جائے تو کیا وہ ملکا کی متعصب آبادی کو فنا کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے؟ ۱۲ر تاریخ کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اُسی وقت قابل عمل ہو سکتا ہے جب ہمارے پاس ۲۰۰۰ پیادہ فوج اور کچھ توپیں ہوں۔ اور ساتھ ہی اُس کے یہ حوصلہ شکن پیغام بھی آیا کہ جرنیل صاحب اُس وقت تک ملکا پر حملہ کرنے کے خلاف ہیں جب تک کہ دریائی قبائل کے ساتھ صلح و صفائی نہ ہو جائے۔

سارے سرحدی علاقہ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۹ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کے کیمپ کی حفاظتی فوج کا ایک حصہ عاریتہً مانگنا پڑا اور ۷ فوسیلرز کو بہ سرعت تمام سرحد کی طرف روانہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھیج دی

گئی تاکہ ہمارے سلسلہ آمد و رفت کی حفاظت ہو سکے ۔ جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ بار برداری کے سامان کے لیے ۴۲۰۰ اُونٹ اور ۲۱۰۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کرکے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے تھے [1]

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔ اصل خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اُس سے آگے کُھلے میدان پر قبضہ کر لیا جائے [2] ۔ امپریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ نومبر تک ختم ہو جانا چاہیے مگر ۲۴ نومبر کو یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ کُھلے میدان میں چند لڑائیاں لڑی جائیں جہاں پر موجودہ مہذبانہ لڑائی کے تمام آلات کام میں لائے جا سکتے تھے ۔ ہمیں ہر اُس چوکی کی حفاظت کرنا پڑی جو ہم آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کرتے تھے ۔ اُسی دن پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک اور بریگیڈ سرحد پر روانہ کر دیا جائے گو جرنیل چیمبرلین

---

[1] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ ۱۰ فروری ۱۸۶۴ء پیرا نمبر ۶۷ ۔ [2] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ یکم فروری ۱۸۶۴ء پیرا نمبر ۲۷ ۔ یہی ایک دستاویز ہے جس کو میں نے اس مہم کے بیان کرنے میں بہت زیادہ استعمال کیا ہے ۔ میں یہ قطعاً امید نہیں کر سکتا کہ اسقدر تباہ کن مہم مخالفانہ تنقید سے بچ جائیگی ۔ مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ نہایت احتیاط سے ٹھیک کی ہوئی سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہے

کی ۱۹ر تاریخ والی تار سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں کمک ضرورت کے وقت سے بہت بعد نہ پہنچے۔

۲۰ر تاریخ کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہو گئے اور افسروں کے علاوہ ۱۱۴ آدمیوں کو زخمی یا قتل کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا جسے پھر ایک خونریز جنگ کے بعد جس میں ہمارے جرنیل صاحب بھی شدید طور پر زخمی ہوئے دوبارہ حاصل کر لی گئی اور افسروں کے علاوہ ۱۲۵ آدمی میدان جنگ میں کام آئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔ ۲۰ر تاریخ کو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیجدینا ضروری سمجھا گیا جن کی کل تعداد ۴۲۵ ہو گئی تھی جرنیل صاحب نے جو تار ۱۹ر تاریخ کو دیا تھا اُس کے آخری الفاظ یہ ہیں "فوجیوں کو ایک مہینے تک دن رات بہت سخت کام کرنا پڑا ہے اور تازہ دم دشمنوں کا مقابلہ ایسے نقصان کے ساتھ کرنا بڑا حوصلہ شکن ہے اس لیے ہمیں کمک کی سخت ضرورت ہے۔ میرے لئے دشمن کا مقابلہ کرنا خوراک بہم پہنچانے کے لئے آدمی مہیا کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اگر آپ تازہ دم فوج کے دستے اُن دستوں کی جگہ جو تعداد اور جوش و خروش میں بہت کم ہو گئے ہیں بھیج سکیں تو ان فارغ شدہ دستوں کو میدانوں میں بھیجا جا سکتا ہے تاکہ اُن سے حفاظت کا کام لیا جائے یہ

بہت ضروری ہے"۔

اب ایک بڑی سیاسی مصیبت کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ہماری فوج میں جو ہر روز کے حملوں سے اُکتا چکی تھی خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی اور وہ بہت سی قتل و خونریزی کے ساتھ نہایت ابتر حالت میں اس درے سے نکال باہر کی جاتی۔ مگر ایسی شکست گو اُس میں اتنی جانیں تلف نہ ہوتیں جتنی کہ ایک بڑی جنگ میں ہوتی ہیں۔ سرحد پر ہماری طاقت کو بالکل تباہ کر دیتی۔ اور اس کے ساتھ جو سیاسی مصیبتیں نازل ہوتیں اُن کی حد کے متعلق کسی قسم کی پیش گوئی کرنا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر پنجاب گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر جرنیل چیمبرلین یہ مناسب سمجھے تو تمام فوج کو پرسولی کے مقام پر واپس لے آئے۔ مگر پنجاب کے حاکموں کی احتیاط پسندی نے برطانوی فوج کی پامردی و استقلال کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ۲۲ تاریخ کو تار آیا جس میں لکھا تھا کہ ہماری فوج نے موجودہ جگہ پہ قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور باوجودیکہ دشواریاں بہت تھیں لیکن پھر بھی ہمارے جرنیل کا خیال تھا کہ آخر کار فتح ہماری ہوگی۔

دوسرے دن نمبر ۲۳ دیسی پیدل فوج بمع چند پورپینوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ دشمن اپنی تمام طاقتیں پہلے ہی صرف کر رہے تھے۔ اب ہماری تازہ دم فوج کے پہنچنے سے قبائل پر خوف و ہراس چھا گیا اور وہ اس بات کو

سمجھنے لگے کہ ایک وسیع فوجی سلطنت کے لا انتہا ہی ذرائع سے جنگ کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے ہی جمعہ کو (یہ ہفتے کا وہ دن ہے جس دن مجاہدین عام طور پر حملہ آور ہوتے ہیں) کوئی حملہ نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی ہم آگے بڑھنے کے قابل نہ ہوئے اور ۲۶ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے بے فائدہ ایک یادداشت لکھی جس میں فوجوں کے ایک ہی جگہ جم جانے پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور آگے بڑھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ جونہی ہماری کمک پہنچی کوہستانوں سے تازہ دم قبائل بھی آموجود ہوئے۔ صرف ایک سردار[1] ۲۰۰۰ آدمی اپنے ہمراہ لایا اور ایک درویش[2] نے ۹۰۰ مجاہدین بھیجے جو یہ عہد کر کے آئے تھے کہ یا تو وہ غازی کہلائیں گے یا شہید۔

۱۵ دسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی جسے آگے بڑھنے کی پرزور تاکید کی گئی تھی۔ اب ہمارے پاس نو ہزار باقاعدہ فوج تھی جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں مثلاً ۹۳ ہائی لینڈرز اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ بظاہر یہ قابل تسلیم امر تھا کہ طاقتور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ہی ایک درہ میں دبکی بیٹھی رہے گی۔ دشمن اس کو اپنے حملوں سے تنگ کیا کریں گے اور وہ ان قابل نہ ہو سکے گی کہ ان کو سزا دے سکے۔ مگر مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا ہم نے اس کا غلط اندازہ لگایا تھا، وہ لوگ جو ان کے ساتھ

---

[1] نبھوت لال خاں آف باجوڑ [2] حاجی آف کنھار

مذہب کی بنا پر شامل ہوئے تھے تو وہ فتح یا شہادت کی اُمید پر بڑے پُرجوش اور بے صبر ہو رہے تھے اور وہ قبائل جو ذرا کم متعصب تھے اُنہیں اس خدشہ کو کام میں لا کر اکسایا گیا تھا کہ اُن کے علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا اُن کا علاقہ میدانِ جنگ بنایا گیا ہے۔ اس طرح شوق اور رقابت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگا دی تھی اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک چشمدید گواہ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں سرحد کی حالت یوں بیان کرتا ہے کہ جوش و خروش دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ پشاور کی سرحد پر مہمند لارڈ کلائیڈ (CLYDE) آنجہانی کے ہاتھوں میں ۱۸۵۲ء میں شب قدر کے مقام پر شکست کھانے کے بعد اسی مقام پر پہلی دفعہ مخالفانہ مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوہاٹ سے دزیریوں اور اتمان خیل کے چھاپوں کی افواہیں بھی مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ ۵ر دسمبر کو مہمندوں نے شب قدر کے نزدیک ہمارے علاقہ پر چھاپہ مارا۔

کوہستانی قبائل کا اتحاد عام طور پر نا پائدار ہوتا ہے جس کام کو ہماری فوج سر انجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) نے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ۲۵ر نومبر کو پشاور کا کمشنر[1] بونیر کے بعض قبائل کو اتحاد سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور گروہ کو جس کی تعداد ۲۰۰۰۰ تھی

---

[1] میجر جیمز۔ پشاور ڈویژن کا کمشنر

اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا۔ اور سوات کے پیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس پرگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ ۱۵ تاریخ کو ہم نے اُن کو جلد فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے کے لئے لالو پر شبخون مارا اور اُن کے چار سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ ۱۶ تاریخ کو ہم نے امبیلا کے گاؤں کو جلا دیا اور قبائل کے دو سو آدمی میدان جنگ میں ہلاک یا مجروح ہوئے۔ دوسرے دن سے پہلے ہی بونیر کے قبائل نے فیصلہ کر لیا اور کمشنر کے پاس حاضر ہو کر احکامات کے صادر ہونے کی درخواست کی۔ یہ علیحدگی مجاہدین کی اُمیدوں کے لئے موت کا حکم رکھتی تھی۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی قبیلہ علیحدہ ہو جاتا تھا۔ دیر اور باجوڑ کے لوگ بھاگ گئے۔ سوات کے فوجی علیحدہ ہو جانے کے لئے ہر وقت پا بہ رکاب بیٹھے تھے۔ یہ اتحاد کوہستانی کہر کی طرح فوراً دُور ہو گیا اور بونیر کے قبائل نے جن پر مجاہدین کا بہت کچھ انحصار تھا ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ مجاہدین کو اُن کی رہائشی غاروں میں ہی جلا دیا جائے گا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر انگریزی فوج کا ایک دستہ بونیریوں کی کمک اور رہنمائی میں پوری سلامتی کے ساتھ پہاڑوں میں سے گزرتا ہوا مجاہدین کی آبادی ملکا تک پہنچ گیا اور اُس کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ۲۳ دسمبر کو یہ بدقسمت فوج درہ امبیلا میں واپس آگئی۔ ۲۵ دسمبر کو تمام کی تمام فوج میدانوں میں پہنچ گئی

اور گھر کو واپس آتے ہوئے اُن پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔

بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا ہے تو اُس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔ ہمارا نقصان جاں ۸۴۷ ہلاک و مجروح تک پہنچ گیا تھا۔ یعنی تمام فوج کا دسواں حصہ جو ایک وقت میں مجموعی طور پر نو ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نقصان صرف درہ میں ہوا تھا۔ اُس نقصان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا جو سردی لگ جانے سے بیمار ہو گئے، یا کسی بیماری کی وجہ سے مر گئے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی تھی اور یہ کہ ان مجاہدین نے قبائل کا ایک خطرناک اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اس اتحاد میں اُن کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی نیز مجاہدین بے ضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں بلکہ یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں اور یہ جہاد کا جو وعظ ہر وقت کرتے رہتے ہیں ممکن ہے کہ تمام سرحدی قبائل یہی وطیرہ اختیار کر لیں اِس بحران کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت ہندوستانی سلطنت کے سر پر کوئی ذمہ دار حاکم موجود نہ تھا۔

وائسرائے لارڈ ایلجن (LORD ELGIN) ایک پہاڑی مقام پر بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ اُن تک تار کے ذریعے خبر رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔

اور نہ وہ کام کرنے کے قابل ہی تھے۔ اس مہم میں باوجودیکہ ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس نے چار سال کے لئے سرحد کو بالکل خاموش کر دیا نصف کے قریب مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور باقی ماندہ کو قبائل اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ اس لئے کہ اُن کے پہاڑوں کی وادیوں میں یہی لوگ جنگ کا باعث ہوتے تھے چنانچہ ان غداروں کے سرداروں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر مامون پایا کہ ۱۸۶۶ء میں اُن میں سے دو نے براہ راست ہمارے افسروں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی ان کوششوں کو ایک تیسرے سردار نے ضائع کر دیا جس نے بار دیگر اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال وہ ۱۸۶۸ء کے آخر تک اپنے اندرونی جھگڑوں میں اس قدر مشغول رہے کہ وہ ہمارے علاقوں میں تاخت و تاراج کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر فروری ۱۸۶۸ء میں وہ سات سو جنگجوؤں کا ایک جتھا بنا کر نکلے تا کہ مختلف قبائل میں اتحاد پیدا کرنے کی بنیاد رکھیں۔ لیکن اُس سزا کی یاد نے جو ہم نے ۱۸۶۳ء میں اُن کو دی تھی اُن کے اس کام کو بہت مشکل بنا دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ قبائل کا دہمی تعصب اُن کی عقل پر غالب آتا گیا اور انہوں نے آگرور کی وادی میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر دیا۔ اُس وقت گورنمنٹ نے لکھا تھا کہ اگر اس سے متعلق

ا؎ مولوی عبداللہ ۲؎ محمد اسحٰق و محمد یعقوب نے سید محمود کی وساطت سے جو پہلے ہماری ملازمت میں تھا کوشش کی تھی۔

ہم جلد کارروائی نہ کرتے تو ہمیں پھر ایک دفعہ بہت بڑے قبائلی اتحاد سے دوچار ہونا پڑتا۔ بہرحال انگریزی حکومت نے اس دفعہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے گا۔ ۸ ر ستمبر کو حکومت عالیہ نے قبائل کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجنے کی اجازت دے دی اور ۳۰ ر اکتوبر کو ہماری فوج نے کمانڈر اعظم کی رہنمائی میں کوچ کیا جو جرنیل وائلڈ (WILD . C.B) کی ماتحتی میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ایک اعلان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ کس طرح بعض قبائل جن کو ہم نے کسی طرح بھی تنگ نہیں کیا تھا اور نہ اُن کے علاقہ میں کوئی مداخلت کی تھی ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقہ میں آ گھسے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا تھا اور اب اُن کو سزا دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ لہذا انگریزی حکومت جس کو بہت پریشان کیا جا چکا ہے اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا جواب دیں۔

میں یہاں پر اس مہم کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا جولائی کے مہینے ہی میں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ضروری برقی پیغامات موصول ہوئے تھے جن میں شورش برپا ہونے کی اطلاعات دی گئی تھیں۔ جیسا کہ فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل[1] نے لکھا تھا کہ تنبیہ اس قدر ضروری اور مدد کے لئے التجا اس

---

[1] گورنمنٹ کے ملٹری محکمہ کے سکریٹری کو خط نمبر ۱۶۳ مجریہ ۵ ر دسمبر ۱۸۹۷ء پیرا (۴)

قدر اہم تھی کیونکہ حقیقتہً ہماری فوج کا ایک دستہ باغیوں کے محاصرہ میں تھا کہ حکومت ہند نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تباہی نے سبق دیا تھا کمانڈر اعظم نے پنجاب کی فوجی چھاؤنیوں کو کمزور کرنے یا سرحدی چوکیوں سے فوجی دستے منگوانے کے بجائے شمال مغربی صوبوں سے رجمنٹیں منگوائی تھیں لڑائی لڑنے والا دستہ چھ ہزار سے سات ہزار باقاعدہ فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ باقی سرحد کی تمام فوج دگنی کر دی گئی تھی اور ہندوستان میں انگریزی فوج کے منتخب شدہ سپاہی مجاہدین کے مقابلہ میں جمع کر دیے گئے تھے[1]۔ اگست اور ستمبر کی چلچلاتی دھوپ میں ہمارے سپاہی ایسی یلغار کر رہے تھے جس کی مثال خوشگوار اور معتدل آب و ہوا میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مثلاً سرنگ لگانے

لہ ۔ رائل توپ خانہ کی ڈی بیٹری اور F بریگیڈ E بیٹری ۔ ۱۹ بریگیڈ R.A اور ۲۲ ۔ ۲ بریگیڈ R.A ۱۹ اور نمبر ۶ کی پہلی بٹالین ۲۰ کی دو کمپنیاں ۔ ۱۰ بنگال کیولری ۔ ۲۳ گورکھا رجمنٹ ۔ ۲۴ نیو انفنٹری ۔ یک بیک راولپنڈی سے ایبٹ آباد کو روانہ کر دی گئیں جو ضلع ہزارہ کا ہیڈ کوارٹر تھا ۔ ۲۰ ۔ N.I نے لاہور سے ایبٹ آباد کو کوچ کیا ۔ ۳۲ فسٹ سیالکوٹ سے دربند جو ہزارہ میں ہے کی طرف روانہ ہوئی اور مہم کے دوران میں ۱۸/18 بھی وہاں پہنچ گئی تھی پہلی اور چوتھی گورکھا دو دوران کے پہاڑی علاقوں سے اور دھرم سالہ سے جنرل وائلڈ کے ساتھ جا ملی ۔ اس کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی ہیں ۔ ۸ ، ۱۹ ، ۳۰ ، ۲۳ ، N.I ۔ ۹ بنگال کیولری اور ۲۰ سار اپنی مختلف چھاؤنیوں ۔ کانپور ، علی گڈھ امرتسر ۔ لاہور کیمبلپور اور راولپنڈی سے روانہ ہوئیں اور ریزرو رکھی گئیں تھیں پشاور اور نوشہرہ میں بھی فوج کو تیار رہنے کا حکم تھا جو سوات اور ہوتی مردان کے مقابل ہے تاکہ گائیڈ کور کو مدد دے سکیں۔

والے اور خندق کھودنے والوں نے ۲۹ دن میں چھ سو میل کی مسافت طے کی۔ اندرون ملک کے صوبجات سے ہماری فوج بہت زیادہ تعداد میں سرحد پر جمع ہو گئی تھی جس سے قبائل بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور قبائل کو اکٹھا کرنے کے لئے مجاہدین کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ ہم نے بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے اپنی فوج کو مع توپ خانہ کے کوہ سیاہ پر چڑھا دیا تھا۔ اور سرحدی اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

کوارٹر ماسٹر جنرل نے لکھا تھا" یہ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کس طرح انگریزی فوج یورپین اور ہندوستانی دس ہزار فٹ کی بلند پہاڑیوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ اور ان کے درمیان جنگ کر رہی ہے۔ اور کمانڈر جرنیل تک کے لئے کوئی خیمہ نہیں۔ بہرحال اس دفعہ بھی ہم شرارت کی جڑ تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے[1]

پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم بھی ختم ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا اُن کو اس بات پر ہی آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں[2]

---

[1] گورنمنٹ کے ملٹری شعبہ کے سکرٹری کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خط نمبر ۱۶۳ مجریہ ۵ر نومبر ۱۸۶۸ء پیرا نمبر ا

[2] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ ۶ر نومبر ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۲۲ ۱۸۶۸ء کی سرحدی مہم کی مندرجہ کیفیت بیان کرنے میں میں نے اس خط سے مدد لی ہے۔ یا اس افسر کی رپورٹ سے جس کا ذکر کفایتہً کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کوارٹر ماسٹر جنرل کا خط مجریہ ۵ر نومبر ۱۸۶۸ء مع اُن ملٹری کیفیات کے جو اس کے ساتھ تھی اس سے مدد لی گئی ہے۔

اب میں نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۲۳ء سے جب کہ اس کی ابتدا ہوئی ۱۸۶۳ء تک جب کہ آخری مرتبہ انہوں نے ہم کو جنگ میں دھکیلا بیان کر دی ہے۔ وہ تمام پرانی مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کی تھیں وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچیں۔ اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ تین مرتبہ قبائل کو یکجا اکٹھا کر دیا۔ جس کی وجہ سے برطانوی ہند کو ہر ایک موقع پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں یکے بعد دیگرے ہر گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کو تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اب تک بھی یہ ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے جو وسط ایشیا میں ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ مگر اس وقت یہ عین ممکن ہے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے۔ یہ جنگ جب کبھی بھی ہوگی (اور جلد یا بدیر ہو کر رہے گی) تو ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کر سکے گی۔ ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہیں اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے ہے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کر سکتے ہیں۔ تو صدیوں کے دوران میں ہندوستانی لوگ شمال کی طرف سے حملہ کرنے کے

حادثی ہو چکے ہیں اور کوئی شخص اُس اہمیت کے متعلق پیشگوئی نہیں کر سکتا جسے یہ باغی کیمپ مغربی مسلمان خانہ بدوش گروہوں کی مدد سے ایک ایسے لیڈر کی سرکردگی میں جو اپنے اندر ایشیا کی قوموں کو جہاد کرنے کے لئے اکٹھا کر سکتا ہو حاصل کر سکتا ہے۔

باب دوم

ایک پرانی سازش

بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا۔ اس ہندوستانی حکومت نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمران تھی۔ اسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دیندار مسلمان ان کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے کو ہی ان کے آخرکار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب وقت اس سرحدی نو آبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اُس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام اُن کو لاتعداد آدمیوں اور روپوں سے مدد دے کر گویا اُن چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے

ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر جن کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے اُٹھنے لگتے ہیں۔

۱۸۲۱،۲۲ء تک سید احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکام نے کوئی توجہ نہ کی۔ اُنہوں نے اپنے جاں نثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت قائم کر دی۔ اس اثنا میں ہمارے افسران اپنے ارد گرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرنے، انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے میں مصروف رہے۔

۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بہت بری طرح جھنجھوڑے گئے۔ کلکتہ میں سید صاحب کے مریدوں میں ایک کسبی پہلوان اور لڑاکا آدمی بھی تھا جس کا نام "تیطو میاں"[1] تھا۔ اُس نے اپنی زندگی ایک باعزت کاشتکار کے لڑکے کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اور ایک چھوٹے سے زمیندار کی لڑکی سے شادی کر کے اپنی حیثیت کو اور بھی بلند کر لیا تھا۔ مگر اُس کی پرجوش اور بے صبر فطرت نے ان فوائد کو پرے پھینک دیا۔ کچھ مدت تک یہ کلکتہ میں ڈنڈے بازی

---

[1] اس کو نثار علی بھی کہتے ہیں۔ یہ چندر پور گاؤں کا باشندہ ہے اور بارہ ست میں رہتا ہے اس کی زندگی کے اکثر حالات کلکتہ ریویو جلد (۱ ۷) میں دیئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو اور پٹنہ کے مجسٹریٹ کی سرکاری رپورٹ کو استعمال کیا ہے۔

سے معیوب طریقہ پر روزی کماتا رہا اور اس کے بعد ایک لٹھ باز گروہ میں شامل ہو گیا جن سے بنگال کے زمیندار اپنے خاندانی جھگڑے اور زمین کی حدود کے تنازعات فیصلہ کرایا کرتے تھے۔ اس پیشہ کی وجہ سے آخرکار اس کو جیل جانا پڑا۔ رہا ہونے کے بعد وہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ روانہ ہو گیا۔ اس مقدس شہر میں اس کی ملاقات سید احمد صاحب سے ہوئی اور وہ ہندوستان میں ان کے اصولوں کا ایک زبردست مبلغ کی حیثیت سے واپس آیا۔ اس نے ضلع کلکتہ کے شمال اور مشرق کی طرف دورہ کیا، بہت سے آدمیوں کو اپنا مرید بنا لیا اور خفیہ طور پر کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریاں کرتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں جب مجاہدین سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو تیطو میاں اس قدر بے دھڑک ہو گیا کہ اس نے اپنا نقاب اتار پھینکا اور ان معمولی سختیوں[1] کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے یہ کسانوں کی پرجوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں جس کے نتیجہ کے طور پر باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں محفوظ کر لیا۔ انگریزی حکام کی نافرمانی کی اور کچھ قتل و غارت کے بعد ان

---

[1] مثال کے طور پر کرشنا رائے نے جو اشامنی کے کنارے ایک بڑا زمیندار تھا، اپنے ان کاشتکاروں پر ڈھائی شلنگ فی کس کے حساب سے ٹیکس لگایا تھا جنہوں نے نیا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ایک اور زمیندار نے اپنے پرائیویٹ جیل میں ایک آدمی کو اس لئے محبوس رکھا کہ اس نے محرم کے دنوں میں تعزیئے جلا دیئے تھے۔

کو پسپا کر دیا۔ کلکتہ سے شمال اور مشرق کی طرف کا علاقہ مع اُس ضلع کے تمام کا تمام باغیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ جن کی تعداد تین چار ہزار کے قریب تھی[۱] اس فرقے نے اپنے کام کا آغاز دن دہاڑے اُس گاؤں کو جلا دینے سے کیا جس نے ان کے روحانی پیشوا کو ماننے سے انکار کر دیا تھا[۲]۔ ایک دوسرے ضلع میں ایک گاؤں[۳] کو لوٹ لیا اور ایک مسجد کو جلا ڈالا۔ اور ساتھ ہی اُس کے دیندار مسلمانوں پر روپیہ اور چاول کا چندہ عائد کیا گیا۔ ۲۳؍ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو باغیوں نے اپنے صدر مقام کے لئے ایک گاؤں منتخب کیا اور اُس کے ارد گرد بانسوں کا ایک مضبوط جنگلہ کھڑا کر دیا۔ ۶؍ نومبر کو ۵۰۰ جنگجو کوچ کرتے ہوئے باہر نکلے ایک قصبہ پر حملہ کیا۔ اس کے پروہت کو قتل کرنے کے بعد دو گائیں ذبح کیں (جو ہندوؤں کا متبرک جانور ہے) جن کے خون سے ایک ہندو مندر کو بے حرمت کیا گیا اور پروہت کی لاش کو تحقیراً بت کے سامنے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے انگریزی راج کا خاتمہ اور دوبارہ اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب بغاوتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے گاؤں میں گائے ذبح کی جاتی اور اگر لوگ اُس کی مخالفت کرتے تو یا تو اُن کو قتل کر دیا جاتا یا اُن کو گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا۔ اُن کے گھروں کو لوٹ

---

[۱] ۲۴ پرگنہ۔ ندیا اور فرید پور

[۲] فرید پور کا ضلع [۳] سرفراز پور ندیا میں۔

لیا جاتا۔ اور پھر جلا دیا جاتا تھا۔ بعینہ وہ اُن مسلمانوں کے بھی خلاف تھے جو اُن کے فرقے میں داخل نہ ہوتے تھے۔ البتہ ایک موقع پر ایک مالدار اور ضدی مسلمان کا گھر بار لوٹنے کے لیئے اُنھوں نے اپنا طریق کار بدل دیا کیونکہ اُنھوں نے اس کی لڑکی کی شادی اپنے گروہ کے ایک سردار سے زبردستی کردی۔

ضلع کے حاکموں کی ناکامیاب کوششوں کے بعد ۱۶ر نومبر ۱۸۳۱ء کو کلکتہ کی ملیشیا فوج کا ایک حصہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مجاہدین نے صلح کی گفتگو کو ٹھکرا دیا اور کمانڈر افسر نے اس خیال سے کہ خونریزی نہ ہو اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ خالی کارتوس بندوقوں میں بھر لیں۔ باغیوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ اس کے جواب میں بے ضرر بوچھاڑ ہوئی اور باغیوں نے فوراً ہمارے سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ کلکتہ سے اتنے فاصلہ پر ہوا جس کو ایک سوار دو گھنٹے میں طے کر سکتا ہے۔ ۱۷ر تاریخ کو مجسٹریٹ نے اِدھر اُدھر سے کمک مہیا کی اور فرنگیوں کو ہاتھی پر بٹھا دیا۔ باغیوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ایک ہزار جنگجو میدان میں آئے۔ اُنھوں نے حملہ آوروں کا اُن کی کشتیوں تک تعاقب کیا اور جس شخص نے بھاگنے میں سستی کی اُس کو تہ تیغ کر دیا۔ اندریں حالات ضروری ہوگیا کہ باغیوں کی سرکوبی باقاعدہ فوج سے کی جائے۔ دیسی پیادہ فوج کا ایک حصہ گھوڑوں والا توپخانہ اور باڈی گارڈ کا ایک حصہ بسرعت تمام کلکتہ سے روانہ کیا گیا۔ باغیوں نے اپنے مورچے کی

حفاظت دہی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوئے فوج کا مقابلہ کھلے میدان میں کیا اور ایک فرنگی کی لاش کو جو اگلے دن مارا گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی صفوں کے آگے لٹکا دیا۔ لیکن ایک نہایت ہی سخت مقابلہ نے اُن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ وہ نہایت ہی ابتر حالت میں اپنے مورچے کی طرف بھاگ گئے اُن کے کیمپ پر ایک ہی ہلہ میں قبضہ جما لیا گیا۔ اُن کا سردار تیطو میاں جنگ میں مارا گیا۔ باقی ماندہ ۳۵۰ میں سے ۱۴۰ کو عدالت نے مختلف سزائیں دیں اور ایک کو جو تیطو میاں کا نائب تھا۔ موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مجاہدین کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ پنجاب کی سرحد پر ان کی قوت بالکل توڑ دی گئی تھی اور ان کا سردار قتل کر دیا گیا تھا جنوبی بنگال میں بھی باغیوں کا یہی حشر ہُوا تھا۔ مگر وہ خلیفے جن کو امام صاحب نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا بچاؤ کے لیئے آموجود ہوئے۔ انہوں نے ایسے عینی شاہد پیدا کیئے جنہوں نے اعلان کیا کہ جس وقت لڑائی زوروں پر تھی ہمارے امام صاحب کو گرد کے بادلوں میں ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے عوام کو یقین دلا دیا کہ خود اُنہوں نے بھی اس طرح گم ہو جانے کی پیشگوئی کی تھی۔ حقیقتہً امام صاحب نے اس قسم کی دعا کی تھی کہ میری قبر میرے مریدوں سے اوجھل رہے" تاکہ حضرت موسےٰ کی طرح میری ہڈیوں کی ناجائز پرستش شروع نہ ہونے پائے۔ اُنہوں نے اس بات کی تبلیغ شروع کر دی کہ

اللہ تعالیٰ نے اُن کو موجودہ کمزور نسلوں سے اُٹھالیا ہے اور جب ہندوستان کے مُسلمان یک جان ہو کر انگریز کافروں کے خلاف جہاد شروع کریں گے تو امام صاحب ظاہر ہو کر فتح کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے۔ اس میں ایک مسلمان کے لئے کوئی ناقابل تسلیم بات نہ تھی۔ ایسی باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت یونس کچھ عرصہ کے لئے گم ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں چھپائے رکھا تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی جب کوہ سینا پر خدا کا پیغام لینے کے لئے گئے تھے تو کسی کو نظر نہ آتے تھے۔ حضرت ذوالقرنین بھی جنہوں نے یاجوج ماجوج کو قید کیا تھا اسی طرح روپوش ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے بھی موت کا مزہ نہیں چکھا۔[۱] اس لئے ہر دیندار مُسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ جہاد میں مصروف ہو جائے۔ پٹنہ کے خلیفوں نے ایک نیا روحانی پیشوا مقرر کیا۔[۲] اور خود اُنہوں نے تعداد میں ہر وقت بڑھتے ہوئے جاں نثار شمشیر زنوں کے درمیان شمال کی طرف سفر اختیار کیا۔

ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کے کرامت کے متعلق تحقیقات کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا اور ہر کام ویسا ہی ہوتا رہا جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔ جنوبی بنگال کا ایک جاں نثار مبلغ جس نے تمام مشرقی اضلاع ڈھاکہ اور

---

[۱] کلکتہ ریویو جلد (۱ ے) جولائی ۱۸۷۰ء صفحہ ۱۰۷۔ [۲] مولوی نصیر الدین صاحب۔

سلہٹ میں تبلیغ کی تھی۔ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا۔ جو وہاں سے ۱۸۰۰ میل دور ہے۔ مگر امام صاحب کی عرصہ دراز تک غیر حاضری نے اُس کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا۔ اور تھوڑی سی منافقت کے بعد اُس نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ دور و دراز کے کوہستانی علاقہ میں اس غار تک ضرور پہنچے گا جس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں خدا نے اس کے امام کو چھپا رکھا ہے اُس کے تحقیق حق کے جوش کو دوسرے خود غرض سرداروں کے حسد پر فتح نصیب ہوئی اور جب وہ اُس پہاڑی خانقاہ تک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس سے بھرے ہوئے موجود ہیں۔ یہ فریب خوردہ مبلغ اس نامراد غار سے بھاگا اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور اپنے کلکتہ کے مریدوں کو ایک غصہ میں بھرا ہوا خط لکھا جو اب تک روپیہ اور آدمی بہم پہنچا رہے تھے۔

اُس نے لکھا "السلام علیکم۔ تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ مُلا قادر نے امام صاحب کا ایک بُت بنایا ہے۔ مگر کسی کو دکھلانے سے پہلے اُس سے یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا اور نہ اُن سے بولنے کی کوشش کریگا کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امام صاحب چودہ برس کے لئے گم ہو جائیں گے تمام آدمی بہت متاثر ہو کر اس بے جان بُت کو دور ہی سے دیکھ کر اُس کی تعظیم و تکریم کر لیتے۔ جب بہت عرصہ تک کوئی جواب نہ ملا تو لوگوں میں امام صاحب

سے ہاتھ ملانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر ملا قادر نے اُن کے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اگر کسی شخص نے پہلے سے اطلاع کئے بغیر امام صاحب سے ہاتھ ملایا تو امام صاحب کے خادم اُس کو پستول مار دیں گے"۔ پھر اُس خط میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ملا قادر نے لوگوں کو اُن کی بداعتقادی پر لعنت ملامت کی۔ کس طرح اُس نے بُت کو عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اور آخر کار کس طرح اُنھوں نے بہت منت سماجت کر کے اُس کو دیکھنے کی اجازت حاصل کی۔ اُنھوں نے اُس کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ ایک بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا تھا۔ اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سے اُس کو انسانی شکل دی ہوئی تھی۔ اس بندہ ناچیز نے ملا صاحب سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن امام صاحب نے خود بطور معجزہ کے اپنے آپ کو ایک گھاس کے بھرے ہوئے مجسمہ کی شکل میں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ ان جعلسازوں کی غلطی اور بے ایمانی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے اور کم از کم میں نے اپنے آپ کو گناہوں سے بچا لیا ہے۔

ایک دفعہ پھر ان مجنونوں کی تحریک تباہی کے قریب معلوم ہوتی تھی مگر پٹنہ کے خلیفوں کے تبلیغی جوش اور مال و دولت نے جو اُن کے تصرف میں تھی۔ مقدس جھنڈے کو خاک سے اُٹھا کر ایک بار پھر بلند کر دیا۔ اُنھوں

نے تمام ہندوستان میں اپنے مبلغ دوڑا دیئے اور مذہبیت کو اس حد تک زندہ کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہُوا تھا۔ ان دونوں خلیفوںؒ نے بذاتِ خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مبلغین بے شمار تھے۔ اور مدبرانہ تنظیم نے اُن کو اس قابل بنا دیا تھا۔ کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے اپنے مریدوں میں اپنا اڈا جما لیتے۔ اس طرح پر ہر ضلع میں مجاہدین کا ایک مبلغ ہوتا اور اُن کے جذبات کو مشتعل رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً سفری واعظ بھی دورہ کرتے رہتے۔ پٹنہ کا مرکزی پراپگنڈا ان کے اقتدار کو پائدار اور مستقل کرتا رہتا تھا۔ شر انگیزی کے لئے ان مبلغوں کی قوت بنگال میں کس قدر بڑھ گئی ہے میں بعد میں بیان کروں گا۔ جنوبی ہند میں انہوں نے جوش و خروش کی وہ آندھی چلائی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں دے دیئے۔ شمال مغربی صوبوں سے انہوں نے رنگروٹوں کی کمپنیوں

لے ولایت علی اور عنایت علی۔ اول الذکر نے بنگال کا دورہ کرنے کے بعد بمبئی، علاقہ نظام اور وسط ہندوستان کو اپنا خاص علاقہ بنا لیا۔ عنایت علی نے اپنی تمام کوششیں جنوبی اور وسطی صوبوں میں صرف کر دیں مالوہ بوگرہ راجشاہی پٹنہ نادیہ اور فریدپور۔ کرامت علی نے اس تحریک کو فریدپور سے شرق کی طرف ڈھاکہ۔ میمن سنگھ نواکھلی اور باریسال تک پہنچا دیا۔ زین العابدین نے جو حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور جس کو ولایت علی نے اپنے جنوب کے دورے میں مرید کیا تھا اپنی کوششوں کا مرکز شمال شرقی بنگال کو بنایا اور سلہٹ اور شمالی پتر ما کے کسانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ کلکتہ ریویو جلد (۱۷)

کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ کیں۔ ہر جگہ پر انہوں نے مسلمان آبادی کے جوش کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اگرچہ بنگالیوں کی اعلیٰ دفاعی قوتیں آخر کار اس تحریک کو موجودہ درجہ تک لے آئیں لیکن کچھ مدت کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں میں ایک ہی جیسے جوش وخروش کے ساتھ زندہ رہی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسروں کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ وفساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا جیسا کہ ظاہر ہے[1]

بہرحال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ وفساد نہ تھی۔ سید احمد صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بنیاد انہیں دو اصولوں کی نشرو اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات انہوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے انصاف چاہا۔ اُن کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی اور صدیوں تک ہندوؤں سے میل جول سے اُن کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم بُت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے۔ گو سید احمد ایک لیٹرا اور جعلساز

---

[1] سرکاری دستاویزات ۱۸۶۵ء

تھا اور اُن کے حواریوں نے بھی بعد میں یہی پیشہ اختیار کیا لیکن میں اس بات کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سید احمد صاحب کی زندگی کا ایک درمیانی حصہ ایسا بھی تھا جس میں ان کا دل و دماغ اپنے برادران وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔ اور ان کا دھیان ہر وقت خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بہت ہی بے قرار جوشیلے اور اعصابی مزاج کے انسان تھے۔ اگرچہ ان کا ظاہری اطمینان اُن کی قلبی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی جس کو ہم مغربی سائنس کی اصطلاح میں مرگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو ایشیائی عقیدہ کے مطابق بڑی ہی متبرک حالت ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب خدائے تعالیٰ سے براہ راست تعلق کا پیدا ہو جانا ہے۔ ان وجدانی کیفیات میں پیغمبران سلف اُن کی بصیرت پر عیاں ہو جاتے تھے اور کشفی طور پر وہ ہندوستان کے دو گذشتہ مذہبی اماموں سے متواتر راہ و رسم رکھتے تھے۔

۱۸۲۰ء میں جب انہوں نے اپنی تبلیغ کا آغاز کیا تو اُس وقت اُن کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ قد درمیانہ تھا اور سینے تک لمبی داڑھی رکھتے تھے۔ وہ کم گو اور خوش اخلاق تھے لیکن جید عالم نہ تھے۔ انہوں نے اپنے برادران وطن کی عملی زندگی پر وعظ کہنا شروع کیا اور ہر قسم کی اصولی بحثوں سے پرہیز کیا جس کے متعلق اُن کے دشمن تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے اور اُن کے مُریدوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ یہ اُن کی بزرگی اور برتری کی شان کے خلاف تھا۔ ان کے پہلے دو مرید

بڑے عالم فاضل تھے اور انہوں نے دہلی کے بہت بڑے عالم شمس الہند کی بحثوں کے درمیان تربیت پائی تھی جن سے امام صاحب کو بھی شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ یہ دونوں شخص اپنے وقت کے جیّد مسلمان عالم[1] کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اُن کی تربیت بڑی احتیاط سے کی تھی۔ وہ مذہبی زبانوں اور شریعت کے قوانین سے اچھی طرح واقف تھے۔ دونوں نے اپنے ہم وطن بھائیوں کے مذہب اور طور طریقوں میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی گو مختلف حد تک۔ اور دونوں نے ایک ہی وقت میں اپنے علم ہم سبق اور گذشتہ لیڈر سے کو اپنا امام تسلیم کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ خدا کی طرف سے اس کام کو پورا کرنے کے لیے مامور تھے۔ جس طرح ان دو عالموں اور قوانین شریعت کے جاننے والوں نے عوام کے سامنے سید احمد صاحب کی جو ٹوٹی پھوٹی عربی بھی نہ جانتے تھے تعظیم و تکریم کی اس کی وجہ سے عوام بھی اس ہونے والے امام کی طرف راغب ہو گئے۔ اسلام کے تمام فرقوں کی تعلیم کو اچھی طرح جاننے کی وجہ سے انہوں نے سید احمد صاحب کے اُس دعوے کی کھلم کھلا حمایت کی جس کو وہ خود تسلیم کر چکے تھے۔ اس مقبول عام عقیدے سے شروع کر کے کہ اللہ تعالے اپنے بندوں کے ایمان کو مضبوط کرنے اور انسانوں کو نجات کا راستہ دکھلانے کے لیے وقتاً فوقتاً امام اور ولی بھیجتا رہتا ہے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ سید احمد صاحب بھی

---

[1] شاہ عبد العزیز صاحب۔ مولوی محمد اسمٰعیل ان کے بھتیجے اور مولوی عبد الحئی ان کے داماد تھے۔

خدا کی طرف سے مامور ہیں اور اس منصب کی تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہیں
پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ سید اور آل رسول ہیں اور اپنی وجدانی کیفیت میں
خدا اور اس کے رسول سے براہِ راست گفتگو کر سکتے ہیں اور اپنی تمکنت کم گوئی
خوش اطواری حتیٰ کہ اپنی شکل و شباہت میں پیغمبر اسلام سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن
بارہ اماموں میں سے جو تمام دُنیا کو مسلمان بنا لیں گے ہندوستان کے بعض مسلمان[1]
تو یہ مانتے ہیں کہ چھ ہو گزرے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ صرف چار ہو گزرے
ہیں۔ سید احمد صاحب اُسی متبرک سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ خوابوں میں رسول
اکرم کی صاحبزادی اور اُن کے خاوند جہاں سے ان کا نسب چلتا ہے، اُن سے
مُلاقات کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے کی طرح اُن کو سلام کرتے ہیں۔ اُن کو خوشبودار
میں نہلاتے ہیں اور اُن کو شاہانہ لباس پہناتے ہیں۔ عوام الناس اور خود
سید احمد صاحب اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہتے ہیں۔ ان دو عالم فاضل
مریدوں کے متواتر دلائل کے سامنے سید احمد صاحب کا انکار اور شک و
شبہ ٹھہر نہ سکتا تھا۔ آخرکار اُن کو اپنے دعوے پر اس قدر پختہ یقین ہو گیا کہ اُنھوں
نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر شاہی اختیارات ہاتھ میں لے لئے۔ آمدنی یہ
دسواں حصہ بطور ٹیکس قائم کیا۔ اپنے خلیفہ مقرر کئے تاکہ بیعت و ربیعت کا سلسلہ

---

[1] سُنی حضرات رشیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ گیارہ ہو گزرے ہیں اور بارھویں امام شمال مغربی سرحد کے پار کہیں چھپے ہوئے ہیں لیکن سُنی مسلمانوں کی تعداد ۹۵ فی صدی ہے۔

جاری رہے اور پشاور میں باقاعدہ طور پر امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ تشریف لے جانے سے پہلے سید صاحب نے اپنے اصولوں کو باقاعدہ مرتب نہ کیا تھا۔ اُن کے خیال کے مطابق دین کی اصلاح ایک عملی شے تھی۔ انہوں نے اپنی پند و موعظت سے سامعین کو بتلایا کہ اگر وہ خدا کے غضب سے بچنا چاہتے ہیں تو اچھی زندگیاں بسر کریں۔ اُن کے ایک مرید نے اُن کے اقوال کو ایک کتاب[1] کی صورت میں جمع کیا ہے۔ جواب اس فرقے کی مقدس کتاب ہے اور عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے مختصر اقوال کو لکھنے والے کی عقیدتمندی نے بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔ لیکن اس قدر زیادتی کے باوجود بھی وہ ایک عملی اخلاق کی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اُن دستاویزات میں جن کی رُو سے اُنہوں نے پٹنہ کے خلیفوں کا تقرر کیا تھا۔ اسی عملی زندگی کی رُوح نمایاں ہو رہی ہے۔ اُن کا صرف ایک ہی اصول تھا اور وہ یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کی جائے براہِ راست عبادت انسانی طور طریقوں اور واسطوں کے بغیر۔ بطور نمونہ چند اقوال ملاحظہ فرمائے جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اُن لوگوں کو جو راہِ حق کے طالب ہیں بالعموم اور ان کو جو سید احمد کے دوست ہیں بالخصوص معلوم ہونا چاہیئے خواہ وہ حاضر ہیں یا غیر حاضر کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مرید ہو جانے کا مطلب صرف

---

[1] صراط المستقیم ۔ مصنفہ مولوی محمد اسماعیل صاحب ۔

یہ ہے کہ خدا کو راضی کرنے کے ذرائع حاصل ہوں اور یہ رسول اکرم کے احکام کو پورا کرنے پر منحصر ہے۔

رسول اللہ کے احکام کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ پہلی شے یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کو معبود نہ ٹھہرایا جائے[1] اور دوسرے کوئی دستور یا طریقہ ایسا اختیار نہ کیا جائے جو رسول کریمؐ اور ان کے خلفا کے وقت میں نہ تھا[2]۔ اول الذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس عقیدے سے کہ کوئی فرشتہ روح یا روحانی رہنما مرید استاد طالب علم، پیغمبر یا ولی کسی کی تکلیفوں کو دور کر سکتے ہیں۔ توبہ کی جائے کسی خواہش یا ارادہ کو پورا کرنے کے لیے اُن کا وسیلہ ڈھونڈنے سے پرہیز کیا جائے اور اس بات سے انکار کیا جائے کہ اُن کو کسی کی طرفداری کرنے یا برائی کو دور کرنے کی طاقت حاصل ہے۔ بلکہ اللہ تعالے کی طاقت کے سامنے ان کو اپنے ہی ایسا بے چارہ اور بے علم سمجھنا چاہیئے۔ لہذا کسی امام، بزرگ، ولی اللہ یا فرشتہ کو اس خیال سے کوئی نذر نیاز نہ دینی چاہیئے۔ کہ اُس سے ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ بلکہ اس لئے کہ یہ خدا کے دوست ہیں۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ ان کو زندگی کے واقعات پر اختیار حاصل ہے یا اسرار الہیہ سے واقف ہیں صریحاً کفر ہے۔

آخر الذکر اصول کا مطلب یہ ہے کہ سچا اور صاف مذہب یہ ہے کہ رسول اللہ کے وقت جس طرح عبادت اور زندگی بسر کی جاتی تھی اس کی سختی کے

---

[1] شرک [2] بدعت

ساتھ پابندی کی جائے۔ اور اُن تمام بدعتوں مثلاً بیاہ شادی کی رسمیں، مرگ کی رسمیں، خانقاہوں کی تعظیم، قبروں پر قبہ بنانا، مُردے کے سالانہ ختم پر بے دریغ روپیہ صرف کرنا وغیرہ وغیرہ سے پرہیز کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے ان رسموں کو بند کرنے کی کوشش کی جائے[1]

۲۳-۱۸۲۲ء میں امام صاحب کے مکہ تشریف لے جانے پر اس عام فہم اصلاحی عقیدہ کو وسعت دی گئی اور باقاعدہ طور پر ترتیب دے دیا گیا۔ انہوں نے اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا۔ اور جو اُن کے عقاید کے مطابق تھا۔ اس کے بانی نے مغربی ایشیا میں ایک دینی سلطنت قائم کر لی تھی بعینہٖ جیسی کہ سید احمد صاحب ہندوستان میں قائم کرنے کی اُمید رکھتے تھے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس مذہب کی آئندہ ترقی کے واقعات کو یہاں تھوڑے عرصہ کے لئے ختم کر دیں اور عرب میں وہابیوں کی ترقی و زوال کی مختصر داستان بیان کریں۔

ایک سو پچاس برس ہوئے کہ ایک نوجوان عرب حاجی جس کا نام عبد الوہاب تھا اور جو نجد کے ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا اپنے ہمراہی حاجیوں کی بدمعاشی اور ریاکاری سے جس سے اماکن مقدسہ کی بے حرمتی کی جا رہی تھی سخت دلگیر ہوا۔ وہ تین سال تک دمشق میں اُن بدعات پر غور و خوض کرتا رہا جو مذہب اسلام میں

---

[1] کلکتہ ریویو نمبر ۵ اپریل ۱۸۷۰ء ص ۹۵۔

پیدا ہو چکی ہیں۔ اور آخر کار ان بدعات کے انسداد کے لئے میدان عمل میں نکل پڑا۔ لیکن حکومت قسطنطنیہ کے کارپردازوں نے اس کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا کیونکہ اس نے ترکی علما پر یہ الزام رکھا تھا کہ اُن کے اعمال و افعال نے شرعی تعلیم کو بالکل بے کار کر دیا ہے۔ چنانچہ ترکی باشندے اپنی برائیوں کی وجہ سے کافروں سے بھی بدتر ہیں لہٰذا عبدالوہاب کو شہر بہ شہر خارج ہونا پڑا۔ آخرالامر اُس نے درعیہ کے سردار محمد ابن سعود کے ہاں پناہ لی اور اسے اپنے دینی عقاید اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے بعد سردار مذکور کو اُس کے گناہوں پر ملامت کی۔ یوں بہت جلد کئی ایک برائیاں دور کرنا ان کے لئے مقدر ہو گئیں۔ اپنے نئے مرید سے مل کر جس کی بیٹی سے عبدالوہاب نے شادی کر لی تھی اس نے ایک مختصر سی عرب لیگ کی بنیاد رکھی اور قسطنطنیہ کی حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف احتجاج اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اب انہیں فتح پر فتح ہو رہی تھی اور وہ بدوی بھی جنھوں نے کبھی بھی محمد کو رسول نہ جانا اور قرآن کو خدا کا کلام نہ سمجھا تھا اُن کے اصلاحی جھنڈے کے نیچے آ جمع ہوئے۔ نجد کا بہت سا حصہ فتح ہو گیا۔ عبدالوہاب اُس کا رُوحانی پیشوا تھا اور اُس کا خسر محمد ابن سعود دنیاوی حاکم۔ اُنھوں نے مطیع شدہ صوبجات میں اپنے نائب مقرر کئے اور اُن کو سختی کے ساتھ اپنا اطاعت گذار بنائے رکھا۔ سعودی قوم کا جرگہ امن کے زمانہ میں قانونی اور دینی امور سرانجام دیتا لیکن جنگ کے زمانہ میں ایک جنگی کونسل کی حیثیت اختیار کر لیتا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نئی سلطنت نے نہایت دلیری سے ترکی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۴۰ء میں بغداد کا بادشاہ جو کبھی وزیر اعظم رہ چکا تھا۔ اس تحریک کے خلاف عملی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ یہ تحریک آخر کار خلیفوں کے نااہل جانشینوں کو باب عالی سے نکال دیتی اور ایک نئی مسلمان سلطنت کی بنیاد رکھتی۔

ان مصلحین نے اپنے آپ کو سول حکومت میں ہر جگہ ایسا ہی قابل ثابت کیا جیسا کہ لڑائی میں فاتحین کی حیثیت سے۔ اُنہوں نے خانہ بدوش عربوں کو جن پر ان کی قوت کا دار و مدار تھا ایک مستحکم وفاق میں جکڑ دیا۔ زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام کیا جنگ کے زمانے میں مال غنیمت کا ⅘ حصہ تو سپاہیوں کو ملتا اور ⅕ حصہ بیت المال میں جمع ہوتا۔ مالگزاری جس کو قرآن میں خیرات کہا گیا ہے سختی کے ساتھ وصول کی جاتی تھی۔ وہ زمین جو بارش یا دریا سے سیراب ہوتی تھی اُس پر سالانہ آمدنی کا دسواں حصہ مقرر کیا گیا اور وہ زمینیں جو مصنوعی طریقوں سے سیراب ہوتی تھیں۔ اُن کی سالانہ آمدنی پر بیسواں حصہ مقرر ہُوا۔ تمام تاجروں کو اپنے اصل سرمایہ کا ڈیڑھ فیصدی دینا پڑتا تھا۔ باغی اور تفرقہ انداز شہر اور صوبے بھی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تھے۔ پہلی بغاوت کی سزا عام لوٹ مار تھی جس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جاتا تھا۔ دوسری بغاوت یا ارتداد پر وہ تمام زمین جس پر شہر بسا ہوا ہو اور اُس کے ارد گرد کی تمام زمین جو اس شہر سے متعلق ہو وہابی

سردار کی ملکیت ہو جاتی۔ چنانچہ مصلحین کی یہ جماعت قدرتاً ایک جنگ جو فرقہ تھا اور نہایت دلیری کے ساتھ اپنے عقاید کو تلوار کے ساتھ منواتا تھا۔ اس لیئے یہ آمدنی کا نہایت ہی قیمتی ذریعہ تھا۔ جو ہر سال دو یا تین لڑائیوں کے ذریعہ حاصل کر لی جاتی۔

وہ عقاید جن کو انہوں نے اس طرح خون کے ساتھ لکھا بذات خود نہایت شریفانہ تھے سب سے پہلے جس چیز کو انہوں نے اہمیت دی وہ اخلاق کی عملی اصلاح تھی۔ ترکوں نے اپنی ذلیل شہوت پرستی کو مقدس شہروں میں پھیلا دیا تھا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر بھی قناعت نہ کر کے وہ حاجیوں کے قافلے میں بد اطوار عورتوں کو بھی لے آتے تھے۔ ترکی کی بدمعاشی کا افسانہ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ عجیب۔ وہ اس سے بھی زیادہ بد اخلاقیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایسی عادتیں جس کو قرآن نے قطعاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ مقدس شہر میں شراب اور افیون کا اعلانیہ استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ مکہ معظمہ کو جانے والا ترکی قافلہ بد اخلاقی کا نہایت ہی نفرت انگیز منظر پیش کرتا تھا۔ یہی وہ عملی اور ظاہری بے حرمتیاں تھیں جن کے خلاف عبد الوہاب نے سب سے پہلے آواز اٹھائی مگر آہستہ آہستہ یہ ایک دینی فرقہ بن گیا جو وہابیت کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

ہندوستانی فرقہ کا بھی بڑی حد تک یہی عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق محمد رسول اللہ کا دین سچی خدا پرستی کا دین ہو گیا۔ اس کے سات بڑے بڑے اصول

ہیں۔ اوّل خدائے واحد پر کلی اعتماد رکھنا۔ دوسرے خدا اور اس کے بندے کے درمیان کسی واسطے کا قطعی انکار۔ جس میں بزرگوں کی دعاؤں اور خود محمد رسول اللہؐ کی شفاعت تک سے بھی انکار شامل ہے۔ تیسرے ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بذاتِ خود قرآن کی تاویلات کرے اور علماءِ سوء کی تمام تاویلات کو رد کرے۔ چوتھے اُن تمام طریقوں مراسم اور ریاکاریوں سے قطعی پرہیز کرنا جن کو گزشتہ اور موجودہ مسلمانوں نے صاف اور سچے مذہب پر ایزاد کیا۔ پانچویں ہمیشہ اُس امام کی تلاش میں رہنا جو سچے مسلمانوں کی تمام کفار کے خلاف فاتحانہ رہنمائی کریگا چھٹے ہر وقت علمی اور عملی طور پر جہاد کی ضرورت کو مدِ نظر رکھنا۔ ساتویں روحانی رہنما کی مکمل اطاعت۔ وہابی اصل میں سنیوں کی ایک ترقی یافتہ جماعت کا نام ہے شمال مغربی صوبجات اور بنگال کے تقریباً تمام مسلمان سُنی ہیں[1]۔

---

[1] یہ سُنی تقریباً سارے حنفی ہیں اور بہت تھوڑے شافعی۔ حنفی امام ابو حنیفہ کے پیرو ہیں جو ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء فوت ہو گئے۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں اور نماز کے وقت ناف پر ہاتھ باندھتے ہیں اور رکوع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو کانوں تک نہیں اٹھاتے اور نماز کے بعد آمین آہستہ کہتے ہیں۔ شافعیوں کا نام بھی اُن کے امام ابو عبداللہ شافعی کے نام پر ہے جو ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ مطابق ۸۱۹-۲۰ء میں فوت ہوئے وہ نماز کے وقت اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں اور جب رکوع کرتے ہیں تو ہاتھوں کو سر کے اوپر اٹھاتے ہیں اور آمین بالجہر کہتے ہیں۔

عبدالوہاب کا انتقال ۱۷۸۷ء میں ہوا اور وہ اپنی تمام فتوحات کو ایک قابل جانشین کے سپرد کر گیا۔ ۱۷۹۱ء میں وہابیوں نے شریف مکہ کے خلاف ایک کامیاب جنگ کی۔ ۱۷۹۷ء میں انہوں نے بغداد کے پاشا کو بہت خونریزی کے ساتھ پسپا کر دیا۔ اور ایشیائی ترکی کے بہت سے زرخیز صوبجات پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۰۱ء میں انہوں نے ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی اور ۱۸۰۳ء میں اس مقدس شہر کو فتح کر لیا۔ اگلے سال انہوں نے مدینہ شریف بھی فتح کر لیا۔ اسلام کے ان دو مستحکم مراکز میں مصلحین نے ہر اُس باشندے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس نے اُن کے طریقے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا مسلمان بزرگوں کی خانقاہوں کو لوٹا اور بے حرمت کیا۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی تک کو بھی نہ چھوڑا۔ اسلام کے ہر ایک دیندار بادشاہ یا شہنشاہ نے اپنے ملک کے بہترین تحائف نذر و نیاز کے طور پر یہاں بھیج رکھے تھے۔ اس طرح گیارہ صدیوں کی جمع شدہ نذر و نیاز صحرائی فرقہ بندوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

اس واقعے سے جو اضطراب اسلامی دُنیا میں پھیلا اس کا اندازہ اُس پریشانی سے کیا جا سکتا ہے جو عیسائی دنیا کو اُس وقت ہوئی جب اُن کو یہ بتلایا گیا تھا کہ برالبورن لیڈروں نے پاپائے روم کے محل کا محاصرہ کر لیا ہے اور خود پاپائے اعظم سینٹ انجیل میں قید ہیں مسلمانوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کو صرف لوٹا ہی نہیں گیا بلکہ اُن راسخ فرقہ پرستوں نے اس کی سخت بے حرمتی بھی کی تھی۔ خود

رسول اللہ کے روضہ اطہر کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ پھر حج کا راستہ بھی جو مسلمانوں کی فلاح کا ذریعہ ہے بند کر دیا۔ قسطنطنیہ کی مرمریں مسجد آیا صوفیہ سے لے کر چین کے دور دراز علاقہ کی کچی مسجد تک مسلمانوں کی ہر عبادت گاہ نالہ وشیون سے گونج اٹھی۔ بعض شیعوں نے تو یہاں تک اعلان کر دیا کہ بارہویں امام کے ظاہر ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ مگر پرانی وضع کے دیندار مسلمانوں کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ وہ جھوٹا پیغمبر یعنی دجال جس کے متعلق آنحضرت نے پیشگوئی فرمائی تھی زمین پر نازل ہو گیا ہے گویا اب قیامت آیا ہی چاہتی ہے۔

۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۹ء تک نماز روزہ کی مخالفت کی بنا پر کوئی قابل ذکر قافلہ حج کی غرض سے صحرا سے نہ گزرا۔ وہابیوں نے شام کو فتح کرتے ہوئے خلیج فارس میں انگریزوں سے بھی جنگ کی اور قسطنطنیہ تک کو خطرہ میں ڈال دیا۔ آخر کار محمد علی پاشا والئی مصر مصلحین کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو گیا ۱۸۱۲ء میں طھوسن کیتھ نے جو سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا پاشا کے لڑکے کے ماتحت مدینہ شریف پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ۱۸۱۳ء میں مکہ معظمہ پر بھی قبضہ ہو گیا اور اس کے پانچ سال بعد یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصہ شہود پر آئی تھی اسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی۔

وہابی جواب خانماں برباد اور منتشر ہو چکے ہیں ایسے عقائد کے حامل ہیں جن کو خوشحال مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے متعلق

اعتقاد رکھنے کے بارے میں یہ اُس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو خدائے احد کے پرستار ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ میں خدائی صفات کے منکر ہیں۔ اُن کے نام پر عبادت کرنے کو منع کرتے ہیں اور اُن بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز دینے کو بُرا سمجھتے ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے۔

بہرحال اُن کی قوت کا راز اُن کے اخلاص اور عملی دینی تعلیم میں مضمر ہے وہ اعلانیہ اس بات پر مصر تھے کہ ہمیں آغاز اسلام کے مسلمانوں کے عقاید، اُن کے سیدھے سادھے اطوار اور اُن کے اخلاق کی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور تبلیغ اسلام میں اُن کے عزم کا پیروکار۔ خواہ اس میں کتنے ہی کفار کا خون کیوں نہ بہے یا خود ان کو کتنی ہی جانوں کی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ان کے دو بڑے اصول یہ ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور دوسرے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دینا (بے خودی) وہ اس رواداری کو بہت بُرا سمجھتے ہیں جس سے پیغمبر اسلام نے اپنے سخت مذہبی تعصب کو کمال ہشیاری سے ملکی قوانین کی حیثیت دے دی ہے۔ اور جن کو اسلامی سلطنتوں نے اپنی اندرونی ضروریات اور خارجی۔ تعلقات کے مطابق رواج دیا ہے۔ وہ ہر ایک مسلمان سے خدا کی مرضی کے سامنے کامل اطاعت چاہتے ہیں (اسلام)۔ جو بانی اسلام کی کامیابی کا راز ہے۔ مگر دیگر اصلاحی جماعتوں کی طرح ہمیشہ اس اصل الاصول پر زور دیتے ہوئے انہوں نے اپنی تحریک کو عالموں میں اپنے معاندانہ اعتقاد کی وجہ سے اور عوام میں دیرینہ رواج اور مقدس روایات کی

مخالفت کی وجہ سے کمزور کر دیا ہے۔ ایشیا کے بہت سے حصوں میں ایک وہابی کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دیگر مسلمانوں سے علیحدہ ہو جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی محبوب روایات اپنے مذہبی تہوار اور اپنے مقدس اعتقادات کو چھوڑ دے۔ اُس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کی عادت بھی چھوڑ دے جو اس کے لئے باعث تسکین خاطر تھی۔ [۱]

بہرحال ہندوستان کے وہابی مسلمانوں میں ایک ایسے اصول کی اشاعت کرتے ہیں جس کی سختی ان تمام تکالیف کو نرم کر دیتی ہے۔ سید احمد صاحب جب مکہ ہی میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ سید احمد صاحب کے عقاید بھی اُن صحرائی بدوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اُٹھانا پڑے۔ لہٰذا مکہ معظمہ میں اُن کی علانیہ بے عزتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبدالوہاب کے پکے مرید تھے۔ پہلے جو چیز ان کی نظر میں محض خواب و خیال تھی اب وہ ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑنے اور صلیب کو انگریز کا زوال

---

۱ یہاں پر اور اس کے بعد میں نے اپنے مضمون مندرجہ انڈین ڈیلی نیوز ۱۸۶۹ء سے درج کیا ہے

کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے جو کچھ ان کی تعلیم میں ابہام تھا اب اُس نے خوفناک اور باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کرلی جس سے عبدالوہاب نے عرب میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اور جس سے سید احمد صاحب کو اُمید تھی کہ وہ ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ عظیم الشان اور پائدار سلطنت قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا علم اُن کو یا صرف خدا کو ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی ظاہری عادات بالکل بدل گئیں۔ اب اُن کی زندگی کا مقصد صرف مرید بنانا ہی نہ تھا بلکہ اُس مقصد اصلی کو پورا کرنے کے لئے یہ محض ایک ابتدائی ذریعہ تھا۔ بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو ان کا وعظ سننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کرسکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی کہ مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی باایں ہمہ وہ ان پرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے معلوم ہوتا ہے اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کے دور دراز جنگجو آبادی پر لگی رہتی تھی۔ اُن کی آئندہ زندگی کو ہم اپنے پہلے باب میں اچھی طرح بیان کرچکے ہیں۔ اب ہمیں اس مجموعہ قوانین کا حال مختصراً بیان کرنا ہے جو اُن کے پیرووں نے اُن کی تعلیم سے اخذ کیا اور جس کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب

برپا کر دیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔

سب سے پہلی مصیبت جو ہندوستان کے وہابیوں کو پیش آئی وہ اُن کے امام کا غائب ہو جانا تھی۔ اُن کی وفات نے اُن کی اس اُمید کو خاک میں ملا دیا کہ وہ خود بہ نفس نفیس ایمانداروں کی فتح و نصرت کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اس غیر اختیاری واقعہ کی تاویل بھی جماعت کے نئے اصولوں کے مطابق کسی نہ کسی طرح ہوتی رہی۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے قریب بہت سی جنگیں اور بغاوتیں ہوں گی۔ نئی نئی اخلاقی جماعتیں پیدا ہوں گی۔ حقیر آدمی باعزت جگہوں پر قابض ہو جائیں گے۔ زلزلے آئیں گے۔ وبائیں پھیلیں گی۔ قحط عام ہو جائے گا۔ آخر الامر امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ وہ آلِ رسول میں سے ہوں گے اور ان کا نام بھی محمد ہو گا۔ ان کی پیدائش پنجاب کے شمال مغربی سرحد کے پار ہو گی اور وہ اپنی زندگی کے کچھ سال انسانوں کی نظروں سے چھپے رہیں گے۔ آخر کار وہ عرب کا بادشاہ بن جائیں گے اور قسطنطنیہ کو دوبارہ فتح کر لیں گے جو اُس وقت عیسائی حکمرانوں کے قبضہ میں ہو گا۔ اُس وقت دجال پیدا ہو گا اور امام کے خلاف ایک سخت جنگ کرے گا۔ تا آنکہ حضرت عیسیٰ دمشق کے مشرق میں ایک سفید مینار کے قریب زمین پر نازل ہوں۔ وہ سرکشوں کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ اور تمام دنیا کو آنحضرت صلعم کے سچے مذہب کے دائرے میں لے آئیں گے۔

ہندوستانی وہابیوں نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ سید احمد صاحب ہی وہ بڑے امام ہیں جن کو حضرت عیسیٰ سے پہلے تشریف لانا ہے۔ مگر جن حالات میں اُن کی زندگی ختم ہوئی اس کی حق و باطل کی جنگ کے عام عقیدہ کے ساتھ کسی طرح بھی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی اس لئے انہوں نے عام عقیدہ کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ امام مہدی قیامت کے نزدیک تشریف نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت کی وفات اور قیامت کے درمیانی زمانہ میں ایک مصلح کی حیثیت سے ظاہر ہوں گے اُنھوں نے یہ ثابت کیا کہ اُن میں موعودہ امام کی تمام نشانیاں (یہ لفظ عیسائیوں کی تاریخ سے لیا گیا ہے) پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے بہت سی مستند کتابوں کے حوالے دے کر ثابت کیا کہ تیرھویں صدی ہجری مطابق ۱۷۸۶ء-۱۸۸۶ء میں ہی امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ سید احمد صاحب ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گو مصلحین شیعوں کو بہت برا سمجھتے تھے لیکن پھر بھی اُن کے علماء کو کام میں لایا گیا تھا۔ شیعہ علما نے سنیوں سے زیادہ صحیح وقت مقرر کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ظہور امام کا وقت ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء تھا۔ کیا یہ محمد رسول اللہ کی حدیث نہیں ہے کہ جب تم خراساں کی طرف سے سیاہ جھنڈے آتے دیکھو تو اُن کے ساتھ مل جاؤ کیونکہ اُن کے ساتھ خدا کا خلیفہ اور ایلچی ہوگا۔ ہندوستان پر عیسائی حکومت کا غلبہ اور زمانہ کی دیگر سینکڑوں علامات اُس پُرآفات زمانہ کی اطلاع دے رہی ہیں جو اُن کے ظہور کا پیش خیمہ ہوں گی۔ اس میں زیادہ قوت پیدا کرنے کے لئے جعلی پیشگوئیاں بنائی

گئیں۔ اُن میں سے چند اشعار جو ایک طویل نظم میں سے لیے گئے ہیں اور جو آج تک شمالی ہندوستان میں پڑھی جاتی ہے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :۔

میں خدا کو دیکھتا ہوں اور دُنیا میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت دیکھتا ہوں۔

میں رذیلوں کو بے فائدہ علم حاصل کرتے اور بزرگی کی قبا پہنتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

میں نیکی کو کم اور تکبر کو زیادہ ہوتے دیکھتا ہوں

میں ترکوں اور ایرانیوں میں جنگ و جدل دیکھتا ہوں

میں سبزہ زاروں کو نیکوں سے خالی اور بدوں سے آباد دیکھتا ہوں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں مگر مایوس نہیں ہوں کیونکہ میں مصیبتوں کے رفع کرنے والے کو دیکھتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ جب ۱۲۰۰[1] سال گزر جائیں گے تو عجیب و غریب واقعات رونما ہوں گے۔

دنیا کے تمام بادشاہوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

---

[1] اصل نظم میں ۵۰۰ تھا لیکن سید احمد صاحب کی ذات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے اس کو ۱۲۰۰ کر دیا گیا تھا کلکتہ ریویو جلد ۵ صفحہ جہاں سے میں نے یہ نظم لی ہے

میں ہندوؤں کو خراب و خستہ اور ترکوں کو مظلوم دیکھ رہا ہوں
اُس وقت ایک امام کا ظہور ہوگا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔
میں دیکھتا ہوں اور پڑھتا ہوں (ا، ح، م، د)[1] یہ حروف حاکم کے
نام کو ظاہر کرتے ہیں۔

ایک اور مرّوجہ پیشگوئی

مولانا نعمت اللہ کی پیشگوئی۔ نوراللہ مرقدہٗ
میں یہ سچ کہتا ہوں کہ ایک بادشاہ ہوگا
اس کا نام تیمور ہوگا اور وہ ۳۰ سال حکمرانی کریگا۔
یہاں پر مسلسل مغل بادشاہوں کے نام آتے ہیں جو شاہ جہاں کی
اولاد کے آخری بادشاہ تک ہیں۔
اس کے بعد ایک اور بادشاہ ہوگا۔
نادر ہندوستان پر حملہ کرے گا۔
اُس کی تلوار سے دہلی میں قتل عام ہوگا۔
اس کے بعد احمد شاہ حملہ کرے گا۔

---

[1] اصل نظم میں م۔ ح۔ م۔ د (محمدؐ) تھا

اور وہ پہلے خاندان کو تباہ کر دے گا
اس بادشاہ کے مرنے کے بعد
پہلے خاندان سے ایک بادشاہ دوبارہ تخت نشین ہوگا
اُس وقت سکھ قوم طاقتور ہو جائے گی اور ہر قسم کا ظلم روا رکھے گی۔
اور چالیس سال تک یونہی ہوتا رہے گا۔
پھر نصرانی تمام ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے
وہ ایک سو سال تک ملک پر حکمرانی کرینگے۔
ان کے زمانے میں تمام دنیا میں بہت ظلم ہوگا۔
ان کو تباہ کرنے کے لئے مغرب میں ایک بادشاہ ہوگا
یہ بادشاہ نصرانیوں کے خلاف اعلان جنگ کرے گا۔
اس لڑائی میں بہت سے انسان قتل ہوں گے
اور مغرب کا بادشاہ تلوار کے ذریعے اس جہاد میں کامیاب ہوگا
حضرت عیسےٰ کے پیروؤں کو شکست ہوگی
پھر اسلام کا غلبہ چالیس سال تک رہے گا۔
پھر ایک بے دین قوم اصفہان سے نمودار ہوگی۔
ان ظالموں کو تباہ کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ نازل ہوں گے اور
مہدی موعود کا ظہور ہوگا۔

اور یہ سب کچھ دنیا کے خاتمہ کے قریب ہوگا

یہ نظم ۵۷۰ھ میں لکھی گئی ۱؎

۱۲۷۲ھ میں مغرب کا یہ بادشاہ ظاہر ہوگا

نعمت اللہ خدا کے رازوں کو جانتا ہے

اس کی پیشگوئی انسانوں کے سامنے پوری ہوگی

ہندوستانی وہابیوں نے اپنے امام کی تبلیغ دین کو منجانب اللہ ثابت کرنے کے بعد تمام معمولی مسائل کو چھوڑ کر اپنی توجہ جہاد کے اہم اصول کی طرف مبذول کر دی۔ اس فرقے کے تمام مذہبی ادب میں اُس شخص کے لئے جو ان کے اصلاحی عقاید پر ایمان لا چکا ہو اسی فرض کی بجا آوری سب سے مقدم ہے ان کی ابتدائی کتابوں میں شریعت کے اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاد ایک بہت بڑے امام کا کام ہے۔ جس طرح بارش سے انسان، حیوان نباتات سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح کافروں کے خلاف جہاد سے تمام آدمی مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو عام فائدہ جس سے تمام انسان حتیٰ کہ بت پرست، کفار، حیوانات اور نباتات بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور دوسرا خاص فائدہ ہے جس سے خاص خاص جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں اور وہ بھی مختلف مقدار میں۔ عام فوائد یہ ہیں۔ خدا کی رحمتیں مثلاً

۱؎ مطابق سنہ ۱۱۷۵-۱۱۷۴ھ سنہ ۱۸۵۴-۱۸۵۳ء

فصلوں کے وقت بارش کا خوب ہونا۔ غلے کا زیادہ مقدار میں پیدا ہونا۔ اچھے زمانہ کا ہونا جس میں انسان ہر قسم کی مصیبتوں سے آزاد ہوتا ہے۔ جائدادوں کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اہل علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ عدالتیں انصاف کرتی ہیں۔ مدعی دلیر اور دولت مند سخی ہوجاتے ہیں۔ ان تمام برکات میں سو فی صدی اضافہ ہوجاتا ہے جب کہ دین اسلام کی عزت کو دوبالا کیا جائے اور مسلمان بادشاہ طاقتور فوج کے ساتھ سربلند ہو اور تمام ملکوں میں اسلامی شریعت کو رواج دینے پر قادر ہوجائے۔ اب جہاں تک خدائی رحمتوں کا تعلق ہے۔ ملک ہندوستان کا مقابلہ ترکی یا ترکستان سے کرو۔ یہی نہیں بلکہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء کے ہندوستان کی حالت کا جب کہ اس کا بہت سا حصہ کفار کے قبضہ میں چلا گیا تھا (دارالحرب) مقابلہ دو یا تین صدی پہلے سے کرو اور اس وقت خدا کی جو رحمتیں نازل تھیں اور اس وقت کے عالموں کی تعداد کا مقابلہ اس وقت کی حالت اور عالموں کی تعداد سے کرنا چاہیئے۔

ان کی مشہور نظموں میں بھی یہی روح کام کر رہی ہے۔ ہماری سرحد پر باغی کیمپ میں صبح و شام اس قسم کے ترانے گائے جاتے ہیں جن کے ساتھ قواعد سیکھتے ہیں اور رنگروٹوں کی وہ کمپنیاں جو ہمارے علاقہ سے بھرتی کی جاتی ہیں شمال کی طرف جاتے ہوئے برطانوی شاہراہوں پر یہی نظمیں گاتی جاتی ہیں

سب سے پہلے خدا کی حمد بیان کرتا ہوں جو تمام تعریفوں سے بالاتر ہے،

میں اس کے رسولؐ کی ستائش کرتا ہوں اور جہاد پر نظم لکھتا ہوں

جہاد وہ جنگ ہے جو محض دین کے لئے لڑی جاتی ہے نہ کہ طاقت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے مقدس کتابوں میں اس کی بہت تعریف لکھی ہے اُن میں سے چند بیان کرتا ہوں۔

کافروں کے ساتھ جہاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور ہر کام سے پہلے اس کے لئے انتظام کرنا چاہیئے۔

وہ شخص جو صدق دل سے اس کام میں ایک پیسہ بھی دیتا ہے وہ آخرت میں سات سو گنا پائے گا اور وہ جو خرچ بھی کرتا ہے اور خود بھی شریک ہوتا ہے وہ خدا سے سات ہزار گنا پائے گا۔ اس کی اولاد کو عذاب قبر سے خوف نہ کرنا چاہیئے نہ قیامت سے اور نہ ہی روز جزا سے۔ بزدل نہ بن۔ خدا کے بھیجے ہوئے امام کا ساتھ دے اور کافروں کو تباہ کر۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تیرھویں صدی ہجری میں ایک امام آیا [1]

اے میرے دوست جب ایک دن مرنا ہی ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ خدا کی راہ میں جان دی جائے ہزاروں آدمی جنگ میں جاتے ہیں اور صحیح سلامت واپس آتے ہیں اور ہزاروں ہیں کہ گھر میں رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں تو دنیا کے دھندوں میں پھنس گیا ہے اور بیوی بچوں کے خیال میں خدا کو

---

[1] مطابق ۱۸۲۶ء-۱۸۳۶ء

بھول گیا ہے تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کتنی مدت رہ سکے گا اور موت سے کب تک بچا رہے گا اگر تو دنیا کو خدا کے لئے چھوڑ دے گا تو ہمیشہ جنت کے مزے لوٹے گا۔

ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام پھیلا دے تاکہ اللہ اللہ کی آواز کے سوائے اور کوئی آواز سنائی نہ دے[۵]

انگریزوں کے خلاف ضرورت جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیشگوئیوں سے پُر اور ضرورت جہاد کے لئے وقف ہے۔ ان کتابوں کے محض نام ہی سے اُن کے تمام و کمال باغیانہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ میں ذیل میں چودہ کتابوں کی فہرست دیتا ہوں[۶]۔ بعض تو اُن میں حد سے زیادہ اشتعال انگیز

۵؎ رسالہ جہاد کلکتہ ریویو (۱۱) صفحہ ۳۹۶۔

۶؎ (۱) صراط المستقیم :- یہ امام سید احمد امیر المومنین کے ملفوظات ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اس کو فارسی زبان میں لکھا اور مولوی عبد الجبار کانپوری نے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۲) قصیدہ :- یہ ایک نظم ہے جس میں جہاد کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اُن لوگوں کے لئے اجر بیان کیا گیا ہے جو اس میں حصہ لیں گے مصنفہ مولوی کرم الہی کانپوری

(۳) شرح وقایہ :- کافروں کے خلاف جہاد پر بحث ہے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں اور مسودات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی ہے اور اُن کا زہریلا اثر اُن کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلغین کے

اس میں مجاہدین کے متعلق اور کن کن سے جہاد کرنا چاہیئے کے متعلق پوری ہدایات موجود ہیں اس میں بہرحال اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جہاد اُس وقت کرنا چاہیئے جب کہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔

(۴) منظم پیشگوئی نعمت اللہ"! - یہ انگریزی حکومت کے زوال کی پیش گوئی ہے۔ اور اس میں ایک مغربی بادشاہ کی آمد کا بیان ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کے پنجے سے رہائی دلائے گا۔

(۵) تاریخ قیام روم مصباح السیر: - یہ عبدالوہاب بانئ جماعت کی سوانحِ عمری ہے اُس پر مظالم، اس کی جنگ ترکی مرتدین کے خلاف وغیرہ درج ہیں (مسودہ)

(۶) آثار محشر یعنی قیامت کی نشانیاں مطبوعہ مولوی محمد علی ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء اس منظوم کتاب کی بہت اشاعت کی گئی ہے۔ یہ پنجاب کی سرحد پر خیبر کی پہاڑیوں پر ایک جنگ کی پیش گوئی ہے جہاں پر انگریز پہلے پہل مسلمانوں کو شکست دیں گے اس پر مسلمان ایک سچے امام کی تلاش کریں گے۔ پھر ایک جنگ ہو گی جو چار دن تک رہے گی۔ جس کا انجام انگریزوں کی مکمل تباہی پر ہوگا۔ یہاں تک کہ حکومت کی بو بھی ان کے دل و دماغ سے نکل جائے گی۔ اس کے بعد امام مہدی کا ظہور ہوگا اور اب کہ مسلمان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اُس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ رُوح پھونک دی جاتی ہے بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے۔

ان میں سے اکثر کتابیں تو علانیہ برطانوی ہندوستان کے بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں کتاب جتنی زیادہ سخت اور باغیانہ ہو اُتنی ہی عوام میں زیادہ مقبول ہو گی لیکن یہ اشتعال انگیز لٹریچر تو اُس مستقل چہارگانہ تنظیم کا ایک حصہ ہے جو وہابی لیڈروں نے بغاوت پھیلانے کے لئے قائم کر رکھا ہے اس کے علاوہ سب سے مقدم پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت ہے (پروپیگنڈا) جس

ہندوستان کے حکمران ہوں گے تو وہ جوق در جوق مکہ معظمہ میں اُن سے جا ملیں گے یہ واقعات اُس وقت رونما ہونگے جب کہ چاند اور سورج دونوں رمضان المبارک کے مہینے میں گرہن ہونگے۔

(۷) تقویت الایمان۔ یعنی استحکام دین۔ مصنفہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی

(۸) تدابیر الاخوی یعنی برادرانہ گفتگو "

(۹) نصیحت المسلمین۔ مسلمانوں کو نصیحت۔ مولوی کرم علی کانپوری

(۱۰) ہدایت المومنین۔ مصنفہ اولاد حسین۔

(۱۱) تنویر العینین۔ آنکھوں کی روشنی۔ عربی میں ہے۔

(۱۲) عبد المحامد۔ عربی میں ہے

(۱۳) تنبیہ الغافلین۔ اردو میں ہے

(۱۴) چہل حدیث:۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس حدیثیں جہاد کے متعلق۔

نے کچھ مدت کے لئے اُس شہر میں انگریزی حکام کا مقابلہ کیا تھا اور جو سرکاری مقدمات کی وجہ سے اب بہت کمزور ہو گیا ہے لیکن پھر بھی تمام بنگال میں کافی اثر رکھتا ہے ۱۸۲۱ء میں امام صاحب نے اپنے خلفا کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس کو کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے کے قریب تھی انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سرِ نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفا جو ان تھک اعمال جو اپنے آپ سے بے پرواہ بے داغ زندگی بسر کرنے والے۔ انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور اُن کے لئے ایک مثال تھے۔ اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہموطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالےٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ مگر صرف اخلاقی نظام ہی ایک بہت بڑی جماعت کو آپس میں اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ اس نئی زندگی کے مذہبی پہلو نے بہت جلد اپنی طاقت کو کھونا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس تحریک کے ابتدائی لیڈروں کے ماتحت بھی اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور خلفا کو ہمیشہ اپنے سامعین کے دلوں میں کافروں کے خلاف نفرت کو بار بار مشتعل

کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ پٹنہ کے پروپیگنڈا نے اس کو صاف طور پر بھانپ لیا تھا اور وقت کی نئی ضروریات کے ساتھ اپنی تعلیم میں مطابقت پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے بیدار شدہ ضمیر کی قوت کی دہشت انگیزیوں پر اعتماد کرنے کی بجائے اُس سخت اور دائمی نفرت وحقارت کو اُبھارے رکھا جو ہندوستانی مسلمان کو انگریزوں سے ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد مسلمانوں کے قلوب کے اعلیٰ ترین قابلیتوں کے بجائے عوام کے تعصبی جوش وخروش پر رکھی جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصہ کو مضبوط کرتے رہیں۔ انہوں نے پٹنہ کے دارالاشاعت کو باغیوں اور غداروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا۔ اور اُس کے اردگرد دیواروں اور حجروں کی کئی ایک بھول بھلیاں بنائی ہوئی تھیں۔ جو خفیہ دروازوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تیار کیے گئے جہاں وہ رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفاء نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کی مسلح ہو کر مدافعت کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن اُن کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچدار راستوں، کمروں، اور باہر جانے کے راستوں کی شکل میں اختیار کیا۔ آخر کار جب حکومت نے اس سازشی اڈے کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو اس عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا گویا اسے ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کارروائی کرنا ہے۔

ہر ایک ضلع کے مبلغین متعصب لوگوں کے گروہ دار الاشاعت میں بھیجتے ان میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھی بھڑکا دیتے تھے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ ان میں سے زیادہ ہشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو اُن کو اُن کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا۔

میں اس بات کے لئے بے قرار ہوں کہ پٹنہ کے خلیفوں کی تاریخ کا جو روشن پہلو ہے اس کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ بہترین اخلاقی نظام سے شروع کرتے ہوئے انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی تعلیم کے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نذر انداز کر دیا اور اپنی زوال پذیر تحریک کو انسانی دل کے بدترین جذبہ کو اُبھار کر مضبوط کیا میں اس کے بعد اُن کے تربیت یافتہ مبلغین کا ایک وعظ مثال کے طور پر نقل کروں گا۔ یہ اُس کی تعلیم کا ایک نمونہ ہے جس سے ان مبلغین کی تربیت کی جاتی ہے پٹنہ کا پروپیگنڈا ہمیشہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لئے دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ کافروں کے ساتھ جہاد کریں اور یا اس لعنتی سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔ کوئی سچا دیندار اپنی روح کو خراب کئے بغیر اس حکومت کا وفادار

نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ جہاد یا ہجرت سے منع کرتے ہیں وہ دل کے منافق ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں جہاں اسلام کے سوائے کوئی اور مذہب رائج ہو وہاں اسلامی قوانین کو رواج نہیں دیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ آپس میں متحد ہو جائیں اور کفار کے خلاف جہاد کریں۔ جو لوگ جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے ان کو کسی اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر جانا چاہیے اس وقت ہندوستان سے ہجرت کرنا ایک ضروری فرض ہے جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے اُس کو صاف طور پر اعلان کر دینا چاہیے کہ وہ عیش و عشرت کا بندہ ہے۔ جو کوئی ایک دفعہ ہجرت کر جائے اور پھر واپس آجائے اس کو جان لینا چاہیے کہ اس کی تمام گذشتہ قربانیاں رائگاں گئیں۔ اگر وہ ہندوستان میں مر جائے تو وہ نجات کا راستہ نہ پائے گا۔

القصہ یہ کہ اے برادران عزیز ہمیں اپنی حالت پر رونا چاہیے کہ خدا کا پیغمبر ہم سے اس بات پر ناراض ہے کہ ہم کفار کے ملک میں بستے ہیں۔ جب خدا کا رسول ہی ہم سے ناراض ہے تو پھر ہم کو کونسی جائے پناہ مل سکتی ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے ہمت دی ہے اُن کو ہجرت کی تیاری کرنی چاہیے کیونکہ ہر طرف سے آگ کے شعلے لپک رہے ہیں۔ اگر ہم سچ بولتے ہیں تو ہمارا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور اگر ہم چپ رہتے ہیں تو ہمارا ایمان خراب ہو جاتا

ہے[1]

باغیانہ لٹریچر اور پٹنہ کے پروپیگنڈا سنٹر کے علاوہ وہابیوں کا دیہاتی علاقوں میں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے ایک باقاعدہ اور مستقل نظام تھا۔ گو یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیاں ثابت ہوتے لیکن میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔ اُن میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی کو شروع کرتے ہیں۔ اکثر اپنے اس مذہبی جوش کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں جس میں ان زہریلے اصولوں کا جن کے ماتحت پٹنہ کے واعظین نے اُن کی تربیت کی تھی شائبہ تک نہیں ہوتا۔

ایک مہذب انسان جو شہر کی گنجان آبادی میں رہتا ہے۔ اگر اُس کے لئے سفر کرنا ممکن ہو تو وہ مال و اسباب اور ہم سفر رفیقوں کی ہمراہی میں بہ سہولت سفر طے کرے گا۔ لہٰذا اُس کے لئے مبلغین کی آزادانہ زندگی اور اُن کے بے یار و مددگار سفر کا تصور ذرا مشکل ہوگا۔ ہم یہ سب محسوس کرتے ہیں کہ تنہائی میں رُوح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں پر اکیلا پاپیادہ سفر کرنے والا درویش گھروں میں رہنے والے لوگوں سے زیادہ اچھا اور بہتر سوچ سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ

---

[1] جامع التفاسیر ۱۸۶۷ء میں دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۹۱۔ پہلا پیراگراف مختصر کر دیا گیا ہے ص ۲۹۱

روحانیت نہ رکھنے والا سب سے کم خود غرض اور بے لوث ہوگا۔ ہر انگریز اس بات پر محبت انگیز جذبہ کے ساتھ یقین رکھتا ہے کہ جب اُس کے اسلاف زیادہ خوش حال تھے تو ہم سے کہیں زیادہ وہ اپنی زندگی انگلستان کی کھلی فضاؤں میں بسر کرتے تھے۔ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کے لئے بچپن کی کوئی یاد اگر دل خوش کن ہو سکتی ہے تو کھُلی ہواؤں میں عیسائی قصہ کی تمثیل کا وہ نظارہ ہے جس میں ایک قافلہ کسی تباہ کن شہر سے نکل کر بیت المقدس میں داخل ہو جاتا ہے۔

کھُلی ہواؤں میں زندگی بسر کرنے کا یہ جذبہ زمانۂ قدیم کے ہندوستان میں درجۂ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ یہاں آب و ہوا کی موافقت نے سرد ملک کے رہنے والے انسانوں کی طرح اپنے بچاؤ کے لئے مکانات کی تعمیر کو غیر ضروری بنا دیا ہے سنسکرت کے قوانین زندگی کے مطابق اونچی ذات کے گھرانوں کے ہر ایک آدمی کے لئے ضروری ہے کہ جس وقت اُس کے ہاں اولاد ہو جائے، وہ اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ چھاڑ جنگل میں تنہا زندگی بسر کرے۔ ہر ایک مقبول عام کہانی میں ہمیں ندی کے کنارے پر ایک قابل عزت سنیاسی کا ذکر ملتا ہے اور شکنتلا کے سب سے زیادہ دلآویز نظارے وہ ہیں جہاں ایک خوبصورت لڑکی وسیع و عریض جنگل کے منظر عام پر سدھائے ہوئے ہرنوں کے جھرمٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ دیہاتی رہنماؤں نے ہندوستان میں اس گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے قومی جذبہ سے بڑی ہشیاری

سے فائدہ اٹھایا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے شہروں کے ناکارہ انسان جب عیاشی اور اوباشی میں اپنا تمام سرمایہ برباد کر چکے تھے یا وہ مجرم جو قانون کی زد سے اب کسی طرح بھی نہیں بچ سکتے تھے کسی نہ کسی مذہبی جماعت میں شامل ہو کر پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے یا بے یار و مددگار صوبہ بہ صوبہ پھرنے کی وجہ سے اپنے اردگرد تقدس کا حصار کھینچ لیتے ہیں۔

وہابی مبلغ کی یہی تجرد پسندانہ زندگی ہے جو سب سے زیادہ ان دیہاتوں کو جو ان کی راہ میں پڑتے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ سال میں کئی کئی مہینے وہ کسی کے گھر میں قدم تک نہیں رکھتا۔ وہ دور و دراز کے صوبوں سے آتا لیکن اس طول طویل سفر میں اس کا کوئی ہم سفر نہ ہوتا بجز شاید ایک وفادار مرید کے جو اُس کو اس کے مراقبوں سے وقتاً فوقتاً چونکا دیتا۔ اس کی حلیم الطبعی اور اپنے گرد و پیش سے بے تعلقی اس کو عام آدمیوں سے ظاہراً بالکل مختلف بنا دیتی ہے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیہاتی اُس کے اردگرد جمع ہو جائیں اور کچھ مُدت کے لئے پانی اور زمین کی حدبندی کے جھگڑوں کو فراموش کر دیں۔ یہ مبلغ ہر وقت بغاوت کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ایسے اصولوں کی اشاعت بھی کرتے جو لامحالہ ان کے قبول کرنے والوں کو بغاوت کی طرف لے جائیں۔ یہ وہ اصول ہیں جن کے متعلق بیکن کے مقولے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ ان سے انسانی سوسائٹی اور انصاف کے قوانین نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ وہ احکامات الہی کو رحم و

شفقت کے بجائے ظلم و تعدی سے رائج کرتے ہیں یہ امر مشکوک ہے کہ بعض مبلغین اس قسم کی زہریلی تعلیم سے قطعاً پرہیز کرتے ہیں۔

۱۸۷۰ء میں بنگال کے متعصب مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے ہوئے میں نے ایک ایسا ہی واقعہ سنا تھا۔ مجھے معاف فرمایا جاوے اگر میری تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ میں وہابی اور غدار کو ہم معنی سمجھتا ہوں۔ ایک وہابی مبلغ دور دراز سے ایک گاؤں میں آوارد ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد ہزاروں مسلمان اس کے گرد جمع ہوگئے۔ آس پاس کے ہندوؤں نے کافروں کے خلاف جوش و خروش کی تباہ کاریوں سے خائف ہو کر جو ایسے اجتماعات کا لازمی نتیجہ ہیں، نہایت عجلت کے ساتھ ضلع کے حکام کی طرف مدد کے لئے پیغامبر دوڑا دیئے اس مبلغ نے اپنے مسلمان سامعین کی بت پرستانہ عادات اور فسق و فجور کی زندگی پر لعنت ملامت کی اور جہاد کے مسئلے پر کسی قسم کا اظہار خیال کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر عام لوگ دور دراز سے محض اخلاقی باتیں سننے کے لئے نہ آئے تھے۔ اس لئے ناامید ہو کر انہوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی جب ہندو پیغامبر واپس آئے تو انہوں نے اس بظاہر دماغی واعظ کو بالکل بے یار و مددگار پایا۔ اب وہ آگ اور تھوڑے سے چاولوں کے لئے بھی ہندو دیہاتیوں کا دست نگر تھا۔

عام طور پر وہابی مبلغ کو اس ضلع کے حاکم سے جہاں سے اس کا گزر ہو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ فی الحقیقت اس کا تبلیغی میدان مجسٹریٹ کی

عدالت کے سامنے کھلی جگہ ہے۔ جہاں مقدمہ باز جمع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا مبلغ جس کے ساتھ میری ملاقات ہوئی وہ اس میدان میں جو کمشنر کے سرکٹ ہاؤس کے متصل واقع ہے ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور پیپل کے ایک درخت کے نیچے اپنے ہم مذہبوں کے ایک انبوہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹے قد کا ایک سرخ گھوڑا تھا جس کی نحیف گردن اُس کے سر کو سنبھالے ہوئے تھی اور جس کی ناہموار دم زمین کے پیدا کردہ زخموں پر سے مکھیاں ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس غریب جانور کی اگلی دو ٹانگیں سوسن کی رسی سے بندھی ہوئی تھیں اور وہ بہت تکلیف سے گھاس کے ایک گچھے سے دوسرے گچھے پر کودتا تھا۔ کبھی کبھی غصے میں آکر وہ اس مکھی پر اپنا منہ مارتا تھا جو اُس کی ناہموار دم کی دست بُرد سے دُور ہو جاتی تھی۔ پھر جلد ہی سفر کی تکان سے چور حیوان کی طرح نہایت بے پروائی سے اپنی گردن کو دراز کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتا اس بزرگ آدمی کے منہ پر تروتازگی تھی اور اس کے ساتھ ایک سفید لمبی داڑھی۔ وہ لفظوں کو چبا چبا کر باتیں کرتا تھا مگر نہ اس قدر کہ وہ اپنی شمالی ہند کی طرز ادا کو جس میں وہ اپنے فقرات ادا کرتا تھا چھپا سکے۔ وہ خود بڑا مخلص معلوم ہوتا تھا۔ آٹھ دس سامعین اُس کو بڑی بے پروائی سے سُن رہے تھے۔ یہ سامعین سوائے اس معمولی سے سلام کے جو چلتے وقت کیا جاتا ہے انگلستان میں چوراہوں پر وعظ کہنے والوں کے مجمع کے سامعین کی طرح نہایت آزادی کے ساتھ آتے

ادر چلے جاتے۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں مئی کا مہینہ تھا لہذا اس بزرگ آدمی نے بڑی سختی کے ساتھ آنے والے میلوں کی برائیوں کی پرجوش مذمت کی اس کو اُن کے ناراض ہو جانے کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔ اُس نے اپنے سامعین کو بتلایا کہ وہ نئے کپڑے پہنیں گے تب بھی اُن کے دل پُرانے ہی رہیں گے۔ وہ اپنے کانوں کو بنگالی بے دینوں کی نفیریوں اور ڈھولوں سے اس قدر بہرا کرلیں گے کہ قرآن کی سچائیوں کو سننے کے بالکل ناقابل ہو جائیں گے۔ محرم کا تمام میلہ۔ اُس کی نقلی لڑائیاں۔ اُس کے فرضی ماتم۔ اُس کی ناشائستہ دعوتیں ریاکاری کی توبہ۔ یہ رب خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حرام ہیں۔

مغربی بنگال کے پُرامن مُسلمان دیہاتی اصلاح پسندوں کی تبلیغ کے لئے بہترین لوگ نہ تھے وعظ ختم ہونے کے بعد جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے تو گو تمام لوگ متفق نہ تھے مگر اکثریت اس مبلغ کے خلاف تھی۔ ایک نے کہا یہ شخص چاہتا ہے کہ اپنے باپ کی قبر کا چراغ گل کر دیں۔ دوسرے نے کہا کہ یہ ہمیں اپنی بچیوں کی شادی کے موقع پر ڈھول ڈھماکہ اور عورتوں کے ناچ سے منع کرتا ہے۔ تیسرا اُس کے کچھ موافق تھا۔ اُس نے کہا کچھ بھی ہو لیکن پھر بھی وہ قرآن کے ستر ہزار چھ سو انتالیس حروف تو جانتا ہے وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ اس کتاب کی رُو سے عبادت صرف خدا ہی کی کرنی چاہئے۔ فی الواقع علما میں سے ہے۔ لیکن مُلا (مسجد میں اذان دینے والا) نے اس خیال کی تردید کردی اور ایک مستند

کی حیثیت سے اس بات کا خاتمہ کر دیا کہ یہ شخص ایک جھوٹے امام کا پیرو ہے جس نے مکہ اور مدینہ کو تلوار کے زور سے فتح کیا تھا۔ جس نے حج کے تمام راستے بند کر دیئے تھے اور خانہ کعبہ کے دروازہ پر یہ لکھ دیا تھا۔ سوائے خدا کے اور کوئی معبود نہیں اور سعود اُس کا رسول ہے (لا الٰہ الا اللّٰہ سعود رسول اللّٰہ) (نقل کفر کفر نباشد)

حاصل کلام یہ کہ وعظ بالکل بے اثر رہا۔ مبلغ کو بھی اس کا پورا پورا علم تھا جس وقت مجمع منتشر ہو گیا تو صرف دو مسلمان جو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس کے پاس رہ گئے وہ اُس کے ہمسفر معلوم ہوتے تھے اور مبلغ کی ہر حرکت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُس نے نہایت اخلاص کے ساتھ اُن سے آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ پھر سو گیا۔ اُس کے میلے کچیلے کپڑوں والے مرید اُس کو باری باری پنکھا جھلتے رہے۔ اُس کے تھکے ماندے گھوڑے نے بھی گھاس کی زیادہ تلاش کرنی چھوڑ دی اور اپنی روزمرہ کی تکالیف کو فراموش کر کے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ دن ڈھلے ذرا ٹھنڈک ہونے پر یہ جماعت جیسے آئی تھی ویسے ہی بے خبر چلی گئی۔ وہ بزرگ آدمی تو گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے دونوں طرف میلے کچیلے کپڑوں والے دونوں مرید چلے جا رہے تھے

یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستانی وہابی ایک بہت بڑی جماعت کا تھوڑا سا حصہ ہے۔ اس ناکام مبلغ کو ان ہزاروں مبلغین میں سے ایک

تصور کیجئے جو اس وقت تمام ایشیا میں چکر لگا رہے ہیں۔ بعض مسجدوں میں تو اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے اور بعض جگہ اُن کو کوئی پوچھتا نہیں یہ سب کے سب پیغمبرِ اسلام کے مذہب سے بدعات کو دُور کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں جس طرح کہ ہیڈ ریبنڈ کے پادریوں نے روم کے کلیسا کی اصلاح کی تھی۔

ہندوستان میں انگریزی راج کی بدقسمتی ہے کہ یہ اصلاح کا فرقہ تحوں سے خلاف نفرت وحقارت کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئی ہے لیکن جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے ابتدائی اصولوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اُن کو حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرنا پڑی۔ کیونکہ راسخ العقیدہ اسلامی حکومت کو بھی ملکی ضروریات کے مطابق شریعت میں تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ خود مکہ معظمہ میں بھی جو مرکز اسلام ہے اور جہاں دنیا میں سب سے زیادہ اس فرقہ کا خوف بیٹھ گیا تھا اس قسم کی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پچھلے چند صفحات میں میں نے ایک بہت ہی معصوم قسم کے وہابی کا نقشہ کھینچا ہے مگر اُن میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے ملک کے سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں کے باغیانہ جذبات کو کمینگی کے ساتھ اُبھارنے ہی کے لئے جیتے ہیں۔ ذیل میں اُس وعظ کا ایک نمونہ پیش کروں گا۔ جس سے وہ انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا بیج بوتے ہیں۔

مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض جہاد ہے۔ مگر جو کوئی ان سے یہ کہے کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جہاد کرنا ناقابل عمل ہے تو وہ جواب دیں گے پھر اُس کا بدل ہجرت ہے۔ یہ ملک اور جو کچھ اس میں پیدا ہوتا ہے اس وقت تک قابل لعنت ہے جب تک اس پر کافر حکومت کر رہے ہیں میں وہابیوں کی جہاد پر اُکسانے کی مثالیں نظم و نثر میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہاں پر وہ دلائل بیان کروں گا جن سے مشرقی بنگال کے بے علم کسانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ اگر ان کے لئے اجتماعی طور پر بغاوت کرنا ناممکن ہے تو پھر دوزخ کی آگ سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر کافروں کے ملک سے ہجرت کر جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (خدا کے نام پر جو بڑا مہربان اور بخشش کرنے والا ہے) وہ تمام دنیا کا مالک ہے۔ محمد رسول اللہ پر خدا کی رحمت نازل ہو۔ ان کی اولاد پر اور ان کے صحابہ پر (نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم و آلہ و اصحابہ اجمعین) آپ سب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جملہ اہل اسلام پر فرض ہے کہ ہر ایک ایسے ملک سے ہجرت کر جائیں جہاں کافروں کی حکومت ہو اور جس میں حاکم شرع محمدی پر عمل درآمد کرنے سے منع کریں۔ اگر وہ ہجرت نہیں کریں گے تو مرنے کے وقت جب رُوح اُن کے جسم سے نکالی جائے گی ان کو عذاب دردناک میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ جس وقت موت کا فرشتہ اُن کی روح کو اُن

کے جسم سے نکالنے کے لیے آئے گا تو اُن سے سوال کرے گا خدا کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اپنے گھروں کو چھوڑ دیتے اور کسی اور ملک میں جا کر آباد ہو جاتے پھر اُن کی روح کو ان کے جسموں سے نکالتے ہوئے ان کو دردناک عذاب دے گا۔ اُس کے بعد وہ قبر کے عذاب میں متواتر مبتلا رہیں گے اور قیامت کے دن دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ عذاب دردناک میں مبتلا رہیں گے۔ خدا مسلمانوں کو ایک ایسے ملک میں مرنے سے بچائے جس پر کافر حکمران ہوں۔

یہاں سے ابھی نکل جاؤ اور ایسے ملک میں چلے جاؤ جہاں مسلمان حاکم ہوں اور دینداروں کے ملک میں جا بسو۔ اگر تم صحیح سلامت وہاں پہنچ گئے تو تمہاری زندگی کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اپنی ضروریات زندگی کی مت پرواہ کرو خدا جو سب کو دیتا ہے جہاں کہیں بھی تم رہو گے تم کو بھی دے گا۔

یہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل میں سے ایک شخص ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد ایک خدا رسیدہ بزرگ کے پاس آیا اور اپنے جرموں کا اقرار کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ اپنے گناہوں کی بخشش کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اُس خدا رسیدہ بزرگ نے کہا اگر ایک شخص دوسرے بیگناہ شخص کو قتل کرے گا تو وہ یقینی طور پر جہنمی ہے۔ تمہارے گناہ کبھی بھی نہیں بخشے جائیں

گے اور تم یقیناً جہنم میں داخل ہو گے۔ اُس اسرائیلی نے سُن کر کہا کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ میں جہنم میں جاؤں گا اس لیئے میں سو پورے کرنے کے لئے تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ چنانچہ اُس نے اس خدا رسیدہ بزرگ کو قتل کر دیا۔ پھر ایک اور بزرگ آدمی کے پاس گیا اور اقرار کیا میں نے سو قتل کیئے ہیں۔ اب اُن کی کیسے بخشش حاصل کر سکتا ہوں اُس بزرگ نے جواب دیا کہ تو دل سے توبہ کر اور کافروں کے ملک سے ہجرت کر جونہی اُس نے یہ سُنا اُس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک کی راہ لی۔ راہ ہی میں اُس کی موت آگئی اور دونوں فرشتے یعنی رحم کا فرشتہ اور عذاب کا فرشتہ اس کی رُوح کو جسم سے نکالنے کے لئے آموجود ہوئے رحم کے فرشتہ نے کہا کہ میں اُس کی رُوح کو جسم سے علیحدہ کروں گا کیونکہ اُس نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی اور ہجرت کی تھی عذاب کے فرشتے نے اُس کو تسلیم کیا اور کہا کہ اگر وہ دوسرے ملک میں پہنچ جانے میں کامیاب ہوتا تو پھر یہ کام رحم کے فرشتے ہی کا تھا اس لیئے اُس نے یہ کام کرنے کا دعوے کیا اور اس کو عذاب دینا چاہا کیونکہ وہ دینداروں کے ملک کو ہجرت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پھر دونوں فرشتوں نے اُس زمین کو ناپا جس پر وہ لیٹا ہوا تھا اور انہیں معلوم ہوا کہ اُس کا ایک پاؤں سرحد کے پار اسلامی ملک کی حد میں پہنچ چکا ہے اس پر رحم کے فرشتے نے اپنا دعوے ثابت ہو جانے کا اعلان کر دیا اور بغیر تکلیف

کے اُس کی رُوح کو اُس کے جسم سے نکال لیا اور اُس کو خدا کے نیک بندوں میں شامل کر دیا۔ آپ نے سُن لیا کہ اگلے جہان میں ہجرت کا کیا اجر ہے، اس لیے خدا سے دُعا کرو کہ وہ ہم سب کو ہجرت کرنے کی قابلیت بخشے اور ایسا کرنے کی جلد استطاعت دے ایسا نہ ہو کہ ہمیں کافروں ہی کے ملک میں موت آجائے۔[1]

لا تعداد باغیانہ لٹریچر۔ پٹنہ کا مرکزی دار الاشاعت اور مبلغین کے علاوہ جو بنگال کے طول و عرض میں چکر کاٹتے پھرتے تھے وہابیوں نے باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لیے ایک چوتھی راہ بھی نکال رکھی تھی۔ ابتداء ہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی اُن کے مریدوں کی تعداد اس بات کی اجازت دے مبلغین کو چاہیے کہ وہاں اپنی ایک مستقل بستی قائم کر لیں۔ اس طرح بنگال کے دیہات میں متعدد غدار بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ بغاوت کے یہ ضلع وار مراکز پٹنہ کے مرکزی دار الاشاعت سے باقاعدہ خط و کتابت رکھتے تھے۔ ہر مرکز روپیہ جمع کرنے اور آدمی بھرتی کرنے کا ایک انتظام کرتا جو بذاتِ خود بالکل مکمل ہوتا۔ ۱۸۶۸ء میں جب ایسے دو ضلعوں کے مراکز کو توڑ دیا گیا تو اُن کے رئیسوں کے خلاف غیر جانبدارانہ طور پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا جہاں اُن کو عمر قید بعبور

---

[1] مختصر کلکتہ ریویو ۱۰۲ صفحہ ۳۸۹، ۴۴۴

دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا ہوئی۔ اُس وقت جو واقعات گواہیوں سے ظاہر ہوئے وہ ہر اُس غیر ملکی حکومت کو خوف دلانے کے لئے کافی ہیں جو انگریزی ہندوستان کی طرح اپنے آپ کو اتنی مستحکم خیال نہ کرتی ہو۔ میں مختصراً ایک قیدی کے حالات زندگی بیان کرتا ہوں۔

تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوا خلفا[1] میں سے ایک جنوبی بنگال کے ضلع مالدہ میں تبلیغی دورے پر آئے اور ماحول کو اپنے مطابق پاکر انہوں نے کئی سال تک اُسی گاؤں میں مقام کیا۔ پھر وہیں ایک لڑکی سے شادی بھی کرلی اور سکول ماسٹر کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ چونکہ معمولی معمولی زمینداروں کے لڑکے اس عالم شخص کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے ضلع کے زمیندار گھرانوں میں اثر واقتدار حاصل کرلیا اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ بغاوت کی تبلیغ شروع کردی۔ انہوں نے لوگوں کو منظم طور پر جہاد کے لئے امداد کرنے کا عادی بنا دیا۔ وہ سرحدی کیمپ کے لئے پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کو ہر سال روپیہ اور آدمی بھیج دیتے تھے۔ اُن کے ٹیکس جمع کرنے والوں میں سے ایک شخص جس کو انہوں نے ایک معمولی کسان کی حالت سے اس درجے تک بڑھا دیا تھا بہت ہی پُرجوش اور عقلمند تھا۔ وہ جمع شدہ رقم سے ایک چوتھائی بطور تنخواہ کے رکھ

---

[1] مولانا عبدالرحمٰن کو جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور ان کو اصلی خلیفہ ولایت علی نے خلافت کی سند دی تھی۔

بننا۔ رفتہ رفتہ وہ گاؤں کے با اقتدار لوگوں میں شمار کیا جانے لگا۔ کئی سال تک وہ اس کام کو بلا رکاوٹ کرتا رہا۔ مگر ۱۸۵۳ء میں قریب کے مجسٹریٹ کو اس کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہو گئے۔ اس دینی ٹیکس جمع کرنے والے کے گھر کی تلاشی ہوئی اور ایسے خطوط پکڑے گئے جن سے اُس کی تجارت کے باغیانہ اور اُس جہاد سے جو سرحدی کیمپ نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا پنجاب میں شروع کرنے کی کوشش کی تھی اُس کے تعلق کا ثبوت ملتا تھا[۵۱]

ضلع کے مرکزی دفتر کے باغی سردار کو زیر حراست کر لیا گیا تھا مگر چونکہ ہم معمولی سازشی لوگوں کو زیادہ اہمیت دینے کے عادی نہیں ہیں لہٰذا اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے چھوڑ دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کی قید سے اُس کے لئے باغیانہ ٹیکس وصول کرنے کے کام کو جاری رکھنا خطرناک ہو گیا تھا۔ بنا بریں وہ مذہبی ٹیکس جمع کرنے سے اپنے لڑکے کے[۵۲] حق میں دستبردار ہو گیا۔ اُس کے جانشین نے اپنے آپ کو اس کام کی انجام دہی کا پورا پورا اہل ثابت کیا اور اُس مقدمہ کے انچارج افسر کے غیر جانبدارانہ بلکہ ایک حد تک قدردانی کے الفاظ میں اُس نے اس وقت سے لے کر مقدمے کے

---

۵۱ ۱۸۵۲ء میں ۴ انفنٹری کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی اور پٹنہ کے مجسٹریٹ نے فوت کے ساتھ اس جماعت کو پھیلنے سے روکنے اور تحقیقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

۵۲ مولوی امیر الدین آف مالدہ

وقت تک نہایت ایمانداری سے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے لوگوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کی"۔ اُس کے کام کی تکمیل میں ضلع کے حاکموں نے کوئی مداخلت نہ کی۔ ہندوستان کا انگریز مجسٹریٹ اُگسٹس ایمپائر کے پادری کی طرح اُن اقوام کے عقاید اور توہمات میں دخل انداز ہونے سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے جو اُس کے زیر نگین ہوں۔ اس طرح مذہبی شعار کی بجا آوری کے بہانے بغاوت بے خطر پھیل سکتی ہے۔ مگر ۱۸۶۵ء میں پٹنہ کے مقام پر سیاسی مقدمے کے دوران[55] میں ضلع مالدہ کے مرکز کا عام بغاوت میں حصہ اچھی طرح واضح ہو گیا تھا۔ اس تنبیہ کے باوجود سرحدی جنگ کے لئے روپیہ اور آدمی فراہم کرتا اور گاؤں بہ گاؤں کھلم کھلا بغاوت کی تعلیم دیتا رہا۔ ۱۸۶۸ء میں جب اُس نے پٹنہ کے خلیفہ کے لڑکے کو مدد کے لئے بلا بھیجا اُس کی عملداری میں تین مختلف اضلاع تھے۔ دریائے گنگا کے دونوں اطراف اور وہ جزائر جو اُس کے ڈیلٹا میں واقع ہیں اور جن کی حد کئی دن کی مسافت تک ہے۔ اس علاقے کے جاہل مسلمان کسان اُس کے زیر اثر تھے[56] ان رنگروٹوں

---

[55] مولوی احمد اللہ کے مقدمے میں بغاوت کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ سیشن کی عدالت سے ان کو موت اور ضبطی املاک کی سزا ہوئی تھی لیکن بعد میں ان کی انتہائی سزا کو عمر قید بعبور دریائے شور سے بدل دیا گیا تھا۔

[56] مالدہ کا تمام ضلع۔ مراد آباد اور راجشاہی کے کچھ حصے۔

کی تعداد جو اُس نے سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کئے کبھی بھی معلوم نہیں کی جا سکتی۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری سرحد پر ان غداروں کی ایک سرحدی چوکی میں کل ۴۳۰ جنگجو تھے اور ان میں سے دس فی صدی اسی شخص کے زیر اثر علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔

اس کا روپیہ جمع کرنے کا انتظام بالکل سادہ اور مکمل تھا۔ اُس نے دیہاتوں کو مالی علاقوں میں تقسیم کر دیا اور ہر علاقے میں ایک محصل ٹیکس مقرر کیا پھر یہ افسر از خود ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس مقرر کرتے اور ان کے جمع کئے ہوئے روپے کا حساب بھی لیتے۔ آخرالامر اُس روپے کو ضلع کے مرکز میں بھیج دیا جاتا، اصولاً ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس ضرور ہوتا۔ جہاں آبادی بہت زیادہ ہوتی وہاں زیادہ آدمیوں کو ملازم رکھ لیا جاتا۔ ایسے مقامات پر ایک[۵۱] امام ہوتا تھا جو نماز باجماعت پڑھاتا اور چندہ وصول کرتا امام کے علاوہ ایک جنرل منیجر ہوتا[۵۲] تھا جس کے ذمے جماعت کی دنیاوی ضروریات کی خبر گیری تھی اور ایک اور افسر تھا[۵۳] جو خطرناک خطوط اور اس نذر و نیاز کو جو سازشیوں کو دی جاتی منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے قاصد مہیا کرتا۔

---

۵۱ دین کا سردار

۵۲ دنیا کا سردار

۵۳ ڈاک کا سردار

یہ نذر و نیاز اور منتیں چار قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک تو اڑھائی فیصدی کا ٹیکس اُس جائداد کا جس پر ایک قمری سال گزر چکا ہو اُس کا نام زکوٰۃ ہے اور وہ شروع ہی سے کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے مصرف میں آتا رہا۔ مگر یہ ٹیکس صرف اُس جائداد پر عاید ہو سکتا ہے جس کی قیمت ایک خاص مقدار سے زیادہ ہو۔ پٹنہ کے خلفاء[۱] نے سرحد سے واپس آنے پر محسوس کیا کہ یہ رقم جہاد کو جاری رکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے وہ خیرات بھی جو غریبوں کا حق ہے اس کام پر لگادی اور غریبوں کا حق پامال کرتے ہوئے بغاوت اور غارت گری کے کام میں صرف کر دی۔ یہ صدقہ مذہبی فرض سمجھ کر سال بھر میں ایک دفعہ ایک اسلامی تہوار کے موقع پر دیا جاتا ہے[۲] جب رمضان شریف کے مقدس مہینے کے بعد مسلمانوں کی مذہبی خوشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اس تہوار کے دن نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں قدم رکھنے سے پہلے ہر وہ مسلمان فرض سمجھتا ہے کہ غریبوں میں صدقہ تقسیم کرے ورنہ گذشتہ تیس دن تک اُس نے جو تکلیف اُٹھائی ہے اُس کا اجر خدا کی طرف سے نہ ملے گا۔

یہ وہ فطرہ[۳] ہے جس کو پٹنہ کے خلفا نے غداروں کے حساب میں جمع کر لیا تھا اُنہوں نے ایک اور ٹیکس بھی مقرر کیا جس سے غریب سے غریب آدمی بھی بچ نہ سکتا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہر خاندان کا مالک کھانا کھاتے

---

[۱] عنایت علی [۲] عید الفطر [۳] صدقہ عید الفطر

وقت اُس کے خاندان میں جتنے فرد ہوں اتنے ہی مٹھی بھر چاول علیحدہ کرتا رہے اور ہر جمعے کے روز گاؤں کے محصل ٹیکس کے حوالے کر دے، اس طرح غلہ کے انبار کے انبار جمع کر لئے جاتے اور ان کو اعلانیہ جہاد کے مصرف کے لئے بھیج دیا جاتا بہر حال یہ ٹیکس کم سے کم مقدار کو ظاہر کرتا ہے جو مذہبی ٹیکس وصول کرنے والوں کو جمع کرنے کا حق تھا۔ اس دانشمند خلیفہ نے ان لوگوں کے جوش وخروش اور فوری جذبات کے اظہار کے لئے جو نئے نئے جماعت میں داخل ہوں اور جو ہلا دینے والے مواعظ سے پیدا ہوتے تھے بہت کافی مواقع بہم پہنچانے کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ نظر بریں اُس نے ایک غیر معمولی چندہ کی ابتدا کی جو وقتاً فوقتاً اختیاری طور پر دیا جاتا تھا یہ اُن چندوں کے علاوہ تھا جو محصلین ٹیکس بطور حق کے طلب کر سکتے تھے۔ تمام ٹیکس جمع کرنے والوں کا سردار ایک سالانہ دورہ بھی کرتا تھا وہ عید کے مواقع پر اپنے علاقہ کے ہر گاؤں میں جاتا اور اس بات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتا کہ ہر خاندان نے پچھلے سال کا تمام بقایا ادا کر دیا ہے۔

بنگال کے ہر ضلع میں اس قسم کے اعلےٰ مرکز موجود تھے۔ جس بدقسمت انسان کو میں نے مثال کے لئے منتخب کیا ہے وہ انہی میں سے ایک تھا اس کا مرکز جنوبی بنگال سے شمال مغرب کو جانے والی شاہراہ پر واقع اور ہر بغاوت پھیلانے والے مبلغ کی قیام گاہ تھا جن کا ہمیشہ وہاں گزر ہوتا رہتا

ہے وہ دونوں خلیفے بھی جنہوں نے سرحد پر امام صاحب کی موت کی تصدیق کی یہاں قیام کر چکے ہیں[1] اور باغی کیمپ کے موجودہ سرداروں میں سے بھی ایک شخص سرحد کی طرف جاتے ہوئے یہاں فروکش ہو چکا ہے[2]۔ پھر کئی ایک دوسرے اضلاع کے سرداران مراکز نیز پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کا امام بھی اس شخص کے مہمان رہ چکے ہیں۔ پہلے پہل اُن کا یہ شہر دریائے گنگا کے دائیں کنارے ضلع کے ہیڈ کوارٹر یا کسی ایسے گاؤں سے جس میں تھانہ چوکی موجود ہو بہت دور واقع تھا۔ قدرت کی تباہ کاریوں نے بھی جنہوں نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا ہے اس تحریک کے پھیلانے میں مدد دی دریائے گنگا اپنی وادی میں آگے اور پیچھے راستہ بدلتا ہوا اپنے دائیں کنارے کی بہت سی زمین کو نگل گیا اور وہاں کی آبادی کا نام و نشان تک بھی نہ چھوڑا۔ اس کے باشندے منتشر ہو گئے کچھ تو دریائے گنگا کے بائیں کنارے نئی آبادی میں چلے گئے اور باقی ماندہ اندرون ملک کے دیہات میں۔ لیکن جہاں کہیں بھی گئے وہیں ہر گروہ نے بغاوت کا ایک نیا مرکز قائم کر دیا۔ جہاں کہیں بھی دریا کوئی نئی زمین چھوڑ دیتا ہے وہاں فوراً ہی وہابی نو آبادی قبضہ کر لیتی ہے اور ایک نئے گاؤں کا مرکز بن جاتی ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قدر مستقل اور دور دراز تک

---

[1] عنایت علی اور مقصود علی [2] نیاض علی [3] نزیان پور

پھیلی ہوئی بے چینی حکومت ہند کے لیے کتنی سخت پریشانی کا باعث ہوتی ہوگی۔ گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔ فی الحقیقت سرحد کی ہر ایک جنگ کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی حدود میں بھی ایک سیاسی مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت بھی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد جو دور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے اور اپنے جرموں کی سزا بھگت رہی ہے یا اپنے مقدمہ کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے اُن لوگوں کے متعلق کچھ کہنا ذرا مشکل ہوگا جن کی سزا ہو چکی ہے کیونکہ یہ اُن لوگوں کی رہائی کے امکانات پر ضرور اثر انداز ہوگی جن پر ابھی مقدمہ چلایا جائے گا یا اس لیے کہ جو گواہیاں ہو چکی ہیں اُن میں ان دونوں قسموں کے اشخاص کے نام مل چکے ہیں۔ یہ سیاسی مقدمات ہندوستان کی تاریخ میں ایک عجیب وغریب چیز ہیں اور جو تفصیلات اُن سے معلوم ہوئیں اُن کو کام میں لائے بغیر بنگال میں اس پرانی سازش کی شاخوں کو معلوم کرنا ناممکن ہوگا۔ لہٰذا مثال کے طور پر میں اُس مقدمے کا انتخاب کرتا ہوں جو وقت کے لحاظ سے موجودہ مقدمات میں سب سے پہلا ہے اور نہایت احتیاط سے اُن چیزوں کو نظر انداز کر دوں گا جو اُن بدقسمت انسانوں پر جن کو قانون نے ابھی تک مجرم ثابت نہیں کیا کسی طرح بھی اثر انداز ہوں۔

۱۸۶۴ء کا مقدمہ ۱۸۶۳ء کی تباہ کن جنگ کا قدرتی نتیجہ تھا۔ پچھلے سال کی طرح یہ محض ایک ہندوستانی رجمنٹ کے چند سپاہیوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی تھی اور نہ کسی اکیلے بغاوت پھیلانے والے مبلغ کی باغیانہ سرگرمیوں کی تفتیش بلکہ ایک ہمہ گیر سازش جو دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی اور جس میں مدافعت کا کافی اچھا انتظام تھا۔ جو جولائی ۱۸۶۴ء میں سر ہربرٹ ایڈورڈ نے انبالہ کے سیشن جج کی حیثیت سے ایک ایسے سیاسی مقدمہ کا فیصلہ سنایا جس میں عدالت کی بیس پیشیاں ہو چکی تھیں۔ انگریزی حکومت کی مسلمان رعیت کے گیارہ افراد کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا اس میں مسلمان قوم کے ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے ان میں بہت بڑے عالم خانوادوں کے چشم و چراغ ایک فوجی ٹھیکیدار۔ ایک فوجی تھوک فروش قصاب۔ ایک عرضی نویس ایک سپاہی ایک دورہ کرنے والا مبلغ ایک خدمت گار نوکر اور ایک کاشتکار تھا ان کی پیروی ایک انگریز وکیل نے کی۔ اُن کو عدالت میں قانونی عذرخواہی اور مقدمے پر بہترین وکالت سے پورا فائدہ اُٹھانے کا موقع حاصل تھا۔ اُن کے تین ہموطن بحیثیت اسیسر کے جج کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس مقدمہ کے خاتمہ پر اُن میں سے آٹھ کو عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور تین کو قانون کی انتہائی سزا دی گئی۔

شمالی احاطہ میں بہت سی قومیں آباد ہیں جو رنگ ڈھنگ میں مختلف

اور الگ الگ زبانیں بولتی ہیں۔ ایک اطالوی کے لئے آسان سی بات ہے کہ لندن میں اپنے آپ کو انگریز ظاہر کرے اور پہچانا نہ جائے لیکن بنگالی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ پشاور میں اپنے آپ کو پنجابی ظاہر کر سکے ۱۸۵۷ء کی سرحدی جنگ میں یہ امر اچھی طرح سے واضح ہو گیا تھا کہ وہ دشمن جو جنگ میں مارے گئے اُن کے چہروں کا رنگ سانولا سیاہی مائل تھا اور یہ نتیجہ ہے جنوبی بنگال کی دلدل اور مرطوب آب و ہوا کا مگر اُس وقت اُن کا سُراغ لگانا مشکل تھا۔ لڑائی کے اختتام پر بے قاعدہ سوار فوج کو منتشر کر دیا گیا۔ اور جن سپاہیوں میں کچھ صلاحیت تھی اُن کو سوار پولیس میں لے لیا گیا۔ اُن میں سے ایک پنجابی بھی تھا۔

یہ شخص بہت ہی جلد انبالہ کے قریب ایک ضلع[۲] میں سارجنٹ کے رتبہ تک ترقی کر گیا مئی ۱۸۶۳ء میں ایک روز علی الصبح جب وہ گشت پر تھا تو اُس نے چار اجنبیوں کو جرنیلی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُن کے پست قد میلے کچیلے چہرے اور چھوٹی چھوٹی داڑھیوں سے اس پرانے سپاہی کو وہ بنگالی غدار یاد آ گئے جو اُس نے ۱۸۵۷ء میں جنگ میں مقتولین کے درمیان دیکھے تھے۔ اس نے اُن سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ اُن کے رازوں کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر کار اسے معلوم ہوا کہ وہ ملکا کے بنگالی

[۲] غزن خاں سے کرنال

سفیر ہیں اور اپنے وطنی صوبہ کو واپس جا رہے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر روپیہ اور آدمی مہیا کرنے کا انتظام کریں۔

اس قومی جتنہ شمالی باشندے نے ان چاروں کو گرفتار کر لیا۔ اُنہوں نے اس سے ایک مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے درخواست کی اور مُنہ مانگی رشوت دینے پر آمادہ ہو گئے۔ جس کے متعلق انتظام یہ تھا کہ پاس ہی تھانیسر کی منڈی میں جعفر نامی عرضی نویس کی معرفت ادا کر دی جائے گی۔ مگر یہ پُرانا سپاہی بڑا نمک حلال تھا اُس نے اُن کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ مجسٹریٹ اُس وقت ان بنگالیوں کو قید کر دیتا تو تمام سازش کا پتہ چل جاتا اور اُن مجاہدین کو ہمارے بدرقہ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا اور انگریزی حکومت ایک خونریز جنگ سے بچ جاتی۔ مگر اُس وقت سلطنت بڑے امن وامان میں تھی۔ تھانیسر اندرون ملک میں ایک پرامن ضلع ہے۔ جہاں بغاوت شاذ ونادر ہی ہوتی ہے۔ پھر ہندوستانی پولیس کا روپیہ بٹورنے کے لئے جھوٹے مقدمات بنا لینا روزمرہ کی بات ہے۔ مجسٹریٹ نے اُن پرامن مسافروں کو قید کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اُس کا ایسا کرنا ننانوے فیصدی مقدمات میں انصاف کی منشاء کے عین مطابق ہے۔

بہرحال یہ سوال مقدمہ تھا۔ سوار پولیس کا سارجنٹ ان قیدیوں کے رہا ہونے پر بہت خفا ہوا۔ اس خیال سے کہ اس کی رپورٹ کو قابل اعتبار نہیں سمجھا گیا

اُس کے پنجابی جذبات پر بہت بُرا اثر کیا اور اب بھی اُس کو پورا پورا یقین تھا کہ ہماری سلطنت پر کوئی اچانک مصیبت نازل ہونے والی ہے جس کا وہم و گمان بھی ممکن نہیں۔

اُس نے ایک ایسے جان جوکھوں کے کام کی تجویز سوچی جس کی مثال سپارٹا والوں کے استقلال اور رومن وفاداری کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ بغیر چھٹی کے اپنی نوکری سے غیر حاضر ہو جانا غداری سمجھا جاتا۔ دور شمال کی طرف اُس کے وطن میں اُس کا ایک لڑکا تھا جس کو وہ خاندانی عزت کے بعد سب سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اس کے گاؤں اور سرحد کے درمیان ہماری سرحدی چوکیاں تھیں جو ہر وقت لوٹ مار کرنے والوں یا بھاگتے ہوئے غداروں کو پکڑنے کے لئے چوکنا رہتی تھیں۔ سرحد کے پار مجاہدین تھے جو انگریزی حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ کرنے کی تیاریاں تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ وہ ہر اُس شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے جن کو اُن کے ایجنٹوں نے ہماری سلطنت سے باقاعدہ طور پر نہ بھیجا ہو۔ باپ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اُس کا لڑکا سرحدی چوکیوں سے بحیثیت ایک باغی کے جو مجاہدین کے کیمپ میں داخل ہونے کے لئے جا رہا ہو پھانسی پر چڑھنے سے بچ بھی گیا تو بھی اُس کو وہابیوں کے ہاتھوں جاسوس سمجھ کر مارے جانے کا خطرہ ہے اس نے اپنے لڑکے کو خاندانی عزت کے نام پر حکم دیا کہ وہ ملکا جائے اور اُس وقت تک واپس نہ آئے جب تک

کہ وہ اُن سازشی لوگوں کے نام معلوم نہ کرلے جو ہماری مملکت میں سرحد پار کے مجاہدین کی امداد کر رہے ہیں۔

لڑکے کو جونہی یہ خط ملا وہ دوسرے ہی دن گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اُس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں اور وہ کس طرح بال بال بچا اُس کا علم صرف اُس کے خاندان کو ہے مگر شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وہابیوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگیا جب انہوں نے ستیانا پر حملہ کیا تو وہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہ کسی نقصان کے بغیر ہماری سرحدی چوکیوں سے گزر گیا اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر ایک شام اپنے باپ کے گھر کے سامنے جو اندرون ملک میں سینکڑوں میل کی مسافت پر تھا سفر، بھوک بیماری کی وجہ سے نہایت خستہ حالی میں اُس راز کو اپنے سینے میں محفوظ کئے ہوئے آموجود ہوا۔ تھانیسر کا منشی جعفر جو خلیفہ کہلایا جاتا تھا۔ ایک بہت بڑا آدمی تھا وہ بنگالیوں اور اُن کے اسلحہ کو کیمپ تک پہنچاتا تھا۔ یہ جعفر تھانیسر شہر میں عرضی نویس تھا۔ اگر یہ سارجنٹ اُن چاروں مسافروں کو چھوڑ دیتا تو وہ اسے رشوت کا روپیہ فوراً ادا کر دیتا۔

میں اس سے بڑھ کر دردناک حالت کا تصور نہیں کر سکتا جو اُس مضبوط پنجابی باپ کی ہوگی۔ وہ روزانہ گھوڑے پر سوار ہو کر بڑے سکون کے ساتھ گشت پر جاتا اور اپنی جھٹلائی ہوئی باتوں پر غور و خوض کرتا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا اس کا تردد اپنے بیٹے کی سلامتی کے متعلق بڑھتا گیا اس کی جان کو محض اس لیے

خطرہ میں ڈالا تھا کہ وہ اپنی عزت کو برقرار رکھ سکے اور اپنے اُن غیر ملکی حاکموں کو بچائے جنھوں نے اس بات کو جھٹلا دیا تھا۔

جعفر کی سوانحعمری جو تھانیسر کی منڈی میں عرضی نویس تھا بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اپنی قابلیت کے صدقے بڑھتے بڑھتے اپنے قصبہ کا نمبردار ہو گیا۔ ایک دن وہ اتفاقاً ایک سفری وہابی مبلغ کا وعظ سننے کے لئے ٹھہر گیا اس خوشحال شہری انسان کے مذہبی جذبات برانگیختہ ہو گئے اُس نے مساجد کے بدعتی اعمال پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اور جون بنین (JOHN BUNYAN) کی طرح گہری روحانی تاریکی سے گزر کر اپنے آپ کو اعلانیہ وہابی کہنے لگا اور ہمہ تن مذہبی اصلاح میں مشغول ہو گیا۔

اس نئے وہابی نے اپنا بہت سا وقت اپنے نفس کا جائزہ لینے پر صرف کیا اور اپنے نفس کی کیفیات کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ اُس نے اپنے مذہبی تجربات کو "جعفر کے نصائح" کے زیرعنوان لکھنا شروع کر دیا اور وہ اُن دستاویزات میں سے ایک نہایت ہی دلچسپ دستاویز ہے جو کسی سیاسی مقدمہ میں پیش کی گئی ہے۔

میں نے یہ کتاب منگل کے روز ۱۰ ذوالحجہ ۱۲۸۰ھ میں لکھنی شروع کی ہے اس کا اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اس میں کسی خاص

طریقہ کی پیروی نہیں کی میں نے صرف وہ واقعات لکھ دیئے ہیں جن کا تعلق دین و دنیا سے ہے۔ اور جن میں میں نے وقتاً فوقتاً حصہ لیا۔ مزید براں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے۔ انسان جن فرشتے حیوانات نباتات جو کوئی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا اپنے وقت مقررہ پر فنا ہو جائے گا سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی ہمیشہ رہنے والا نہیں جو کوئی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا وہ ہزار سال تک کیوں نہ زندہ رہے آخر افسوس اور ندامت کے سوا اور کچھ نہ لے گیا۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہ کی۔ اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد جب کہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میرا چھوٹا بھائی چھ مہینے کا تھا۔ ہم اپنی والدہ کی سرپرستی میں تربیت پانے لگے۔ میری والدہ بالکل ناخواندہ تھی اسے کوئی مذہبی تعلیم بھی نہ دی گئی تھی۔ لڑکپن میں میں نے تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور آوارہ پھرتا رہا جب مجھے تھوڑی سی عقل آگئی تو میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔

۱۸۵۶ء میں عرضی نویسوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ تمام وکیل اور عرضی نویس مجھ سے قواعد و ضوابط اور کونسل کے ایکٹ کے متعلق مشورہ لینے لگے اور میں سب سے بازی لے گیا۔ یہ عرضی نویس ایک قسم کے غیر رجسٹر شدہ معمولی وکیل ہوتے تھے جو مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ بازوں کی عرضیاں لکھ دیا کرتے تھے اور چھ آنے سے ڈیڑھ روپیہ تک فیس

لیتے تھے۔ جعفر کی بہت اچھی پریکٹس تھی مگر کافروں کی عدالت سے جو روپیہ وہ اس طرح حاصل کرتا تھا وہ اس کے لئے کسی کام کا نہ تھا۔ اس کے برعکس اس پیشے میں میں نے اپنے مذہب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ایسا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں۔ اگر میں اس کو اختیار نہ کرتا تو میری مذہبی حالت بہت اچھی ہوتی، جب مجھے عدالتوں سے فرصت ملتی خواہ دو دن ہی کے لئے تو میری حالت بہت اچھی ہو جاتی۔ کافروں کے مسلمان ملازمین کے ساتھ محض تعلق ہی کا ہونا میرے پیشے کا ایک بڑا نقص تھا اور میرے نفس کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔

اگرچہ جعفر اس پیشے کو پسند نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی اس کی قانون دانی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ارد گرد کے طاقت ور زمیندار خاندانوں نے اس کو اپنا خاندانی قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ بہت ہی مخلص آدمی تھا وہ اپنی دنیاوی کامیابی کو اپنے مذہبی فرائض کی بجاآوری میں کبھی حائل نہیں ہونے دیتا تھا اس کے پاس جو کوئی آتا اثر قبول کئے بغیر نہ رہتا۔ آنحضرت کی طرح اس نے اصلاح کا کام اپنے ہی گھر سے شروع کیا۔ چنانچہ اس کا ایک منشی اپنے آقا کے سخت امتحان کے وقت بھی وفادار رہا اور انبالہ کے سیشن جج کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے کے اندر اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو مذہب کی حمایت میں گواہی دیتا رہا۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر قانونی کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اُس کو نمایاں کر دیا۔ اور اب وہ اُن لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں تو جعفر عرضی نویسی کے کام پر تھانیسر واپس آ گیا اور خدا کی ان بوجھی مصلحتوں پر غور کرنے لگا جس نے کفار کو فتح دی اب وہ پہلے سے بھی زیادہ اس کام سے دل برداشتہ ہو گیا تھا یعنی عرضی نویسی کے نہایت ہی مذموم کام سے کھلم کھلا جنگ میں اس کو شکست ہو چکی تھی دیکھنا یہ تھا کہ خفیہ سازشوں سے کیا کچھ مل سکتا ہے۔ جعفر بہت دور دراز تک پھیلی ہوئی وہابی سازش میں داخل ہو گیا اُس کے خفیہ فرائض نے اس کے نفرت انگیز پیشہ کو بھی مقدس بنا دیا کیونکہ وہ اُس کے متعلق لکھتا ہے "میں نے اس کام کو ایک خاص آدمی کے حکم کے مطابق اور ایک خفیہ مقصد کے لئے اختیار کر رکھا ہے" ؎۱

؎۱ سر ہربرٹ ایڈورڈ نے فیصلہ سناتے ہوئے جعفر کی قابلیت کی یوں داد دی تھی۔ اس قیدی کی سخت دشمنی، باغیانہ تگ و دو اور اس کی شرارت انگیز قابلیت میں مبالغہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ لکھا پڑھا شخص ہے اور اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں اور اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔

یہ خاص شخص پٹنہ کا مولوی یحییٰ علی ہندوستان میں وہابیوں کا پیشوا تھا۔ اُس کا
خفیہ مقصد یہ تھا کہ مہابن کی وہابی نوآبادی کو رنگروٹ اور اسلحہ بہم پہنچائے جائیں
جو اُس وقت علانیہ انگریزی حکومت سے برسرپیکار تھی۔

میں پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کا حال بیان کر چکا ہوں۔ اُس وقت
یہ شخص اُس کا رہنما تھا۔ ۱۸۶۴ء کے مقدمہ سے بہت پہلے تمام ہندوستان میں
یہ ادارہ اصلاحی جماعت خانہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عمارت محلہ صادق پور
کے بائیں جانب واقع تھی۔ اس کا حجرہ کافی بڑا تھا اور گلی میں پیچھے کی جانب
بھی کافی دور تک چلا گیا تھا اپنی ظاہری صورت میں اس کا منظر ویسا ہی
حسرتناک اور ویرانی کا تھا جو ہندوستان کی ہر اینٹ چونے کی عمارت کا
برسات کے بھیگنے کے بعد ہو جاتا ہے۔ یہ مشرق کے متعلق ہمارے عظیم الشان
تصور کا کیسا حقیر جواب ہے اس تمام عمارت میں سب سے زیادہ اہم ایک
معمولی سی مسجد تھی جس میں ہر وقت نماز باجماعت ادا کی جاتی اور جمعہ کے دن
خطبہ بھی ہوتا۔ جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے ان میں سب سے زیادہ
کفار کے خلاف جہاد کے فرض پر زور دیا جاتا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلایا جاتا کہ
عقیدہ کے بغیر ہر فعل عبث ہے۔ سامعین کو بہت بڑے روحانی خطرے سے
آگاہ کیا جاتا اور اُن کو روحانی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ یہ لوگ
پیغمبر اسلام کی سادہ عبادت کا مقابلہ اُن تکلیف دہ مراسم اور لاتعداد نفلیوں

اور مساجد کے رکوع و سجود سے کرتے اور اُن لوگوں کو بہت بُرا کہتے جو وہابیوں کے جہاد یا ہجرت کے اصولوں کی مخالفت کرتے تھے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کا روحانی معیار عام لوگوں کی قابلیت سے بہت بلند تھا اُن کے سامعین اگرچہ وقتی طور پر بہت گہرا اثر قبول کرتے لیکن اپنے دلوں میں بالعموم یہ خیال لے جاتے تھے کہ اُن کے لئے بڑی دشواریاں پیدا کر دی گئی ہیں شہر کی دوسری مساجد کے وعظ گو محلہ صادق پورہ کے واعظوں کے علم اور فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے تھے لیکن اس بنا پر اُن کی مخالفت کرتے کہ وہ متبرک روایات کے منکر اور سخت قواعد وانع ہوئے ہیں

یحییٰ علی مبلغین کا افسر اعلیٰ اور خلیفہ تھا۔ اُس نے پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کے نظام کو بڑی مضبوطی لیکن نرمی کے ساتھ چلایا۔ اُن رنگروٹوں کا جو سفری مبلغ جنوبی بنگال کے مختلف اضلاع سے جوق در جوق بھیجتے تھے جماعت خانہ میں بڑا جوش سے خیر مقدم کیا جاتا تھا جن لوگوں کو فوراً مجاہدین کے کیمپ میں بھیج دینا مقصود ہوتا اُن کو اُن کے دنیاوی بھائی کے سپرد کر دیا جاتا اور وہ اُن کو جماعت کے اصولوں سے زیادہ واقفیت پیدا کرنے کی تکلیف دیئے بغیر اُن کے جوش و خروش کو مستقل کر دیتا۔ یہ دُنیاوی بھائی دارالاشاعت کا وظیفہ خوار اور بہت ہی کارآمد شخص تھا اُس نے جماعت خانہ کے تمام دنیاوی کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ اور رنگروٹوں کے سامنے ہر روز

جہاد کے فرائض پر وعظ کہنا۔ وقتاً فوقتاً جب رئیس المبلغین کسی اور کام میں مشغول ہوتا تھا تو دینیات کے طالب علموں کو جو اصل میں اُس کے ماتحت نہ تھے الہیات پر درس بھی دیتا وہ جو کچھ بھی کرتا پورے اخلاص کے ساتھ کرتا۔ اور انجام کار بڑی دلیری کے ساتھ اپنے آقا کے ہمراہ انبالہ کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے کے اندر کھڑا ہو گیا۔

یحییٰ علی رئیس المبلغین کے بہت سے فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں تمام سفری مبلغین کا روحانی پیشوا ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت کرتا۔ پھر جملہ دستاویزات کو خفیہ زبان میں ترتیب دینا اور لکھنا جس کے ذریعہ سے بڑی بڑی رقوم بلا خوف و خطر سلطنت کے دارالخلافہ سے سرحد پار کے مجاہدین تک پہنچ جاتیں اس کے ذمے تھا۔ وہ مسجد میں نماز با جماعت کی امامت کرتا اور اُن بندوقوں کی جانچ پڑتال بھی کرتا جو مجاہدین کو روانہ کی جاتیں۔ وہ طالبعلموں کو الہیات پر درس دیتا۔ اُس کا اپنا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ عربی مصنفین سے بھی اُس نے بہت کافی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

لیکن بوڑھ شیعوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کے دارالدعوت سے جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گدام کہتے تھے مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے رنگروٹوں کا پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی وہابی سے راستہ میں ہزاروں تکلیف دہ سوالات پوچھے جانے کا احتمال تھا

شمال مغربی صوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اُس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی اس کی اجنبیت ہر گاؤں میں اپنے قد اور زبان کی وجہ سے بہت جلد ظاہر ہو جاتی لیکن اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی قابلیت پوری طرح بروئے کار آئی اُس نے تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا اور اُن کا انتظام معتبر مریدوں کے ہاتھوں میں رکھا۔ اُس نے جرنیلی سڑک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اس طرح سرحدی کیمپ کو جانے والا ہر باغی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا۔ اُس کو یقین تھا کہ ہر پڑاؤ پر اُس کو ایسے دوست مل جائیں گے جو اس کے لئے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راہ میں پڑتے ان کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ہمہ تن مصروف اور ایک مقامی سازشی ان کا صدر ہوتا تھا۔ یحییٰ علی نے ایسے اشخاص کے انتخاب میں اپنی مردم شناسی کا بہترین ثبوت دیا تھا کیونکہ ان میں کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا لالچ کی ترغیب سے اپنے تباہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

سب سے زیادہ یہ کہ یحییٰ علی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پٹنہ میں انگریزی حاکموں کے ساتھ اُس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اُس کے خاندان میں سے ایک ہماری حکومت میں اعزازی عہدے پر مامور اور دوسرا ہماری سرحد

پر مجاہدین کی چھاپے مارنے والی جماعت کی رہنمائی کر رہا تھا۔ شاید ہی کسی عدالت نے ایسے پُر اثر الفاظ کہے ہوں گے جیسے کہ سر ہربرٹ ایڈورڈ نے اُس کے لیے سزائے موت تجویز کرتے ہوئے کہے سر ہربرٹ نے کہا کہ یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے جس کا انکشاف اس مقدمہ میں ہُوا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا اور اس مذہبی رعایت کے ماتحت پٹنہ کی مسجد میں اسلام کے قابل نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ اُس نے اپنے ماتحت ایجنٹ رکھے ہوئے تھے جو روپیہ جمع کرتے اور جہاد کی تعلیم دیتے تھے اُس نے اپنی سازشوں سے ہندوستانی حکومت کو ایسی سرحدی جنگوں میں دھکیل دیا جس میں سینکڑوں جانیں ضائع گئیں۔ وہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہے اور اپنی لاعلمی کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ جو کچھ بھی اُس نے کیا سوچ سمجھ کر عمداً اور سخت باغیانہ طریقہ پر کیا۔ وہ موروثی باغی ہے اور ایک متعصب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خواہش ایک مذہبی مصلح کے درجہ تک پہنچنے کی ہے۔ لیکن بنگال کے برہمو سماجی ہم وطنوں کی طرح دلیل اور فطرت صالح سے اپیل کے بجائے وہ اپنا مقصد سیاسی انقلاب سے پورا کرنا چاہتا ہے اور دیوانوں کی طرح اُس حکومت کے خلاف سازش کرتا ہے جس نے شاید ہندوستانی مسلمانوں کو تباہی سے بچایا اور یقینی طور پر مذہبی آزادی عطا کی۔

جعفر عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس المبلغین نے ۱۸۶۴ء کے قیدیوں

میں سازش کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے نمایاں جگہ حاصل کی لیکن اُن کی باغیانہ قابلیت کا عملی پہلو دہلی کے تھوک فروش قصاب اور پنجاب میں انگریزی فوجوں کو گوشت مہیا کرنے والے ٹھیکیدار محمد شفیع کی قابلیت سے بہت کم تھا۔

محمد شفیع شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے تاجر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ گورنمنٹ کے ساتھ اس کے خاندان کے تعلقات کی بنا ہمیں وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کی جنگوں کی طرف لے جاتی ہے محمد شفیع کے دادا پڑدادا معمولی چرواہے تھے۔ جنہوں نے کچھ تو اپنی ہوشیاری اور کچھ کفایت شعاری سے دنیا میں نام پیدا کر لیا تھا۔ یہ زمانہ دولت کمانے کا تھا نہ کہ اُس کو جمع کرنے کا۔ جنگ کے زمانہ کی قیمتیں رائج تھیں۔ فوجوں کی آمد و رفت متواتر جاری تھی اس لئے کمسریٹ والوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ شمالی ہندوستان کے گڈریوں کے ساتھ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ ممکن ہے اس غدار خاندان کی برتری کا سبب ۱۷۶۹ء کا قحط ہو جس نے انگلستان کے باشندوں کو ہندوستان میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کے لئے بیدار کیا تھا۔ اس کا دادا اس صدی کے آخری دس سالوں میں بہت بڑی ذمہ دار حیثیت پہ پہنچ گیا۔ وہ کمسریٹ کے افسر انچارج کی پوری تسلی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکے پورے کرتا رہا۔ محمد شفیع کے والد نے اس تجارت کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔ اُس روپے کے علاوہ جو معمولی معمولی چرواہوں کو وہ پیشگی دے دیا کرتا تھا اُس کے پاس اور سرمایہ بھی تھا۔ اس سرمائے کو اس

نے قابل اعتماد ضمانتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سود پر لگا دیا۔ اس کا لڑکا بہت بڑی جائداد کا مالک تھا لیکن والد ہی کا پیشہ اختیار کرنے والی ہندوستانی ذہنیت کی تقلید میں اپنی خاندانی تجارت میں پوری قوت کے ساتھ مشغول ہوگیا۔ وہ ایک ساہوکار اور تھوک فروش قصاب کی حیثیت سے ایسے ناجائز افعال کرتا رہا جن کی پاداش میں اُس کو انبالہ کے جیل خانہ میں قید ہونا پڑا۔

چونکہ رئیس المبلغین سب کا سردار تھا اس لیے یہ شخص اس سازش کا دست راست تھا۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں تھیں اور جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اس کے خاندانی یا تجارتی تعلقات تھے وہ اپنے بڑھتے ہوئے ملازمین کے دائرے کا مرکز تھا۔ جو شمالی ہند کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے تھے اُس کے تجارتی کاروبار نے ہماری سرحد پار کی گڈریہ اقوام کے ساتھ بھی اس کے تعلقات پیدا کر دیئے تھے۔ وہ ہر سال انگریزی حکومت سے لاکھوں پاؤنڈ وصول کرتا اور اپنے کام میں وقت کا بڑا پابند تھا وہ افسروں کا حکم خادموں کی طرح بجا لاتا تھا۔ اُس نے کمشریٹ کے افسر کو فریب دے کر فوجوں کو گوشت مہیا کرنے کے ٹھیکہ کی تجدید کرا لی درآں حالیکہ وہ ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا۔

اس طرح ہمارا ملازم ہونے کی حیثیت سے جو عالمگیر اقتدار اُسے حاصل ہو گیا تھا وہ اُس کو ہماری تباہی اور بربادی کے لئے استعمال کرنے لگا وہ اس سازش کا خاص عہدہ دار تھا

ساہوکار تھا اور مجاہدین کو روپیہ پہنچانے کے لئے اُس نے اُن مراعات کو جو فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہایت چالاکی سے استعمال کیا اس میں بذاتِ خود کوئی مذہبی جوش نہ تھا۔ اُس نے کسی بیہودہ تعصب کو اپنی عقل پر غالب نہ آنے دیا۔ وہ کسی مجاہدانہ قربانی کا ملزم نہ تھا۔ وہ اس عرصہ میں بہت ہی ہوشیار، دوربین اور کمینہ تجاویز سوچنے والا ثابت ہوا۔ اُس نے بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے عمداً اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالا اور اپنی قابلیت اور اعلیٰ حیثیت پر اعتماد کیا جن کے متعلق خیال تھا کہ اسے راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ رکھیں گی۔

جعفر عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس المبلغین نے اپنی وفاداری کا کبھی جھوٹا دعویٰ نہیں کیا، اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں۔ وہ بڑے مخلص اور با اصول انسان تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اُس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا جس کو ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ لہٰذا اب جبکہ انہوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی ہے تاریخ اُن کے اس انجام کو پُر رحم جذبات کے ساتھ یاد کرے گی مگر محمد شفیع جیسے شخص کے لئے اس قسم کے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے اُس نے ہمارے ہاتھوں کو کاٹنے کے لئے چاقو۔ وہ اُن لوگوں سے جو اس کے ساتھ سازش میں شریک تھے ناجائز سود وصول کرتا رہا۔ اس نے باغیانہ خطرے کے درمیان دلالی کا کام بہت زیادہ منافع پر کیا۔ یہ اُن تمام مذہبی اور چھوٹے موٹے غداروں کے کے درمیان جن کو ۱۸۶۴ء کے مقدمہ نے انبالہ جیل میں جمع کر دیا تھا بالکل ہی الگ

حیثیت رکھتا تھا اُس کو اُن خطرناک بدمعاشوں کی یادگار سمجھئے جو روما کی جمہوریت کے زوال سے پیدا ہو گئے تھے اور جن کا حال سسرو (CECERO) کی آتش بیانی نے ہم تک پہنچایا۔ اس میں اوپیونیس (OPPIANCEINS) کی بےرحمی اور لینٹیولس (LANTUILUS) کی احتیاط پائی جاتی تھی ایک بڑا مہلک قدم جو اُس نے اٹھایا یہ تھا کہ جنگی جہاز کے نمودار ہونے پر بھی اُس نے بحری ڈاکوؤں کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اب میں نے غداروں کی جماعت کی اُن چار نمایاں شخصیتوں کا حال بیان کر دیا ہے جو ہر روز انبالہ کی عدالت میں اکٹھے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے تھے۔ باقی آٹھ کا حال میں جج کے اُن الفاظ میں جو اُس نے فیصلہ سناتے وقت کہے تھے۔ مختصراً بیان کرتا ہوں۔ رحیم قیدی کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُس کے مکان میں باغیانہ کام سرانجام پاتے رہے اُسی کے مکان میں بنگالی مجاہدین اکٹھے ہوتے اور رہتے تھے اُسی کے خدمت گار کے پاس خزانہ ہوتا تھا وہی رنگروٹوں کے کھانے پینے کا انتظام کرتا اور مجاہدین کو روپیہ بھیجتا۔ اُسی کا سالا یحیٰی علی[1] اُس کے

---

[1] یحییٰ علی رئیس المبلغین۔ عبدالغفار پٹنہ کے دارالاشاعت کا دنیاوی کاروبار سنبھالنے والا جعفر تھانیسر کا عرضی نویس جو رنگروٹوں کو پنجاب سے گزارتا تھا اور محمد شفیع جو انگریزی فوجوں کو گوشت مہیا کرتا تھا۔ اور باغیوں کو روپیہ پہنچاتا تھا اور فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے فوجی نقل و حرکت کی اطلاع دیتا تھا۔

زنان خانہ کے دروازہ پر باغیانہ تبلیغ کرتا یہ یحییٰ علی سے کم قابلیت رکھتا ہے اور زیادہ مشہور نہیں لیکن حکومت کے خلاف جو کچھ اس سے ہوسکتا تھا اُس نے کیا۔

آلٰہی بخش کے متعلق ثابت ہوگیا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کے ذریعہ پٹنہ کے مولوی جمع شدہ سرمایہ کو تھانیسر میں جعفر کے پاس پہنچاتے تا کہ ملکا اور ستیانا کو بھیج دیا جائے۔

پٹنہ کے ایک شخص حسینی کے متعلق ثابت ہُوا کہ وہ آلٰہی بخش کا نوکر ہے اور اُس نے اس کو باغیانہ مقدمہ کے لئے روپیہ پہنچانے کے لئے ملازم رکھا اُس نے یحییٰ علی کے حکم کے مطابق عبدالغفار سے سونے کی مہروں کی بہت بڑی تعداد وصول کی اور اُن کو اپنی واسکٹ میں سی لیا اور اس طرح ان مہروں کو پٹنہ سے دہلی لایا جہاں اُس نے حسب الحکم جعفر قیدی کے حوالے کردیں یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ اُس کے پاس چھ ہزار کے منی آرڈر تھے وہ ان باغیانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتا تھا جس کے لئے اسے ملازم رکھا گیا۔

قاضی میاں جان کے متعلق ثابت ہوگیا ہے کہ اس کا کام جہاد کی تبلیغ اور بنگال میں مجاہدین بھرتی کرنا تھا وہ پٹنہ کے سازشیوں اور کوہستانی مجاہدین کا سرگرم رکن تھا۔ وہ روپیہ جمع کرتا اور بھیجتا اور خطوط وغیرہ بھی پہنچاتا چنانچہ ایک نہایت اہم باغیانہ خط وکتابت جو پٹنہ اور ملکا سے آئی ہوئی تھی اسی کے گھر سے دستیاب ہوئی معلوم ہوتا ہے اس کے تین چار فرضی نام تھے۔

عبدالکریم کے خلاف ثابت ہو چکا ہے کہ وہ محمد شفیع قصاب کا خفیہ ایجنٹ تھا اور باغیانہ مقاصد کے لئے پٹنہ کے منی آرڈروں کا روپیہ دلواتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے یحییٰ علی سے خط وکتابت بھی کرتا۔

تھانیسر کے حسینی قیدی کے خلاف ثابت ہوا ہے کہ وہ اس سازش میں محمد جعفر اور محمد شفیع قیدیوں کا خفیہ ایجنٹ اور دلال تھا اور وہ جعفر سے محمد شفیع کی طرف ۲۹۰ طلائی مہریں لے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کے ذمے یہ بات تھی کہ ان مہروں کو ملکہ کے دشمنوں تک پہنچا دے۔

عبدالغفار نمبر ۲ کے خلاف ثابت ہوا کہ وہ پٹنہ میں یحییٰ علی کا مرید تھا اور یحییٰ علی نے جعفر قیدی کی مدد کے لئے اس کو تھانیسر میں رنگروٹ بھرتی کرنے کی جگہ پر مقرر کیا۔ اس نے اس کام میں ضرور معاونت کی نیز یہ کہ وہ یحییٰ علی کے ساتھ باغیانہ امور کے بارے میں خط وکتابت بھی کرتا۔[1]

اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے یہ ہیں۔ پہلی وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا دوسرے وہ رازداری جس کے ساتھ اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں

---

[1] اس نام کا ایک اور بھی عبدالغفار تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ [2] ۱۸۶۴ء کے مقدمہ کی داستان کے لئے ہم نے اپنے اس مضمون سے مدد لی ہے جو ہم نے [illegible] میں لکھا تھا۔ تمام واقعات مقدمہ کے تحقیق شدہ ریکارڈ سے لئے گئے ہیں یا وہ مقامی حاکم کے خطوط اور سرکاری رپورٹوں سے لئے گئے ہیں۔

عمل میں لائی گئیں۔ تیسرے وفاداری کا وہ رویہ جو اُن کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھا۔ اُن کی کامیابی کا راز اُن کے عمدہ فرضی ناموں کی ترکیب اور خفیہ زبان پر تھا جس کا نمونہ ذیل میں پیش کرتا ہوں[1]۔ لیکن میں اس یقین کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام سازشی سوا محمد شفیع فوجی ٹھیکیدار کے اپنا کام انتہائی خلوص اور فطرتی جوش کے ساتھ خدائی کام سمجھ کر کرتے۔ ان کا عہد تھا کہ مرتے دم تک اس فرض کو سرانجام دیں گے۔ انگریزی حاکموں نے بھی اس کا انتظام نہایت دانشمندانہ طریقے سے کیا۔ کیونکہ اُن میں جو بدترین باغی تھا اسے بھی شہادت کا درجہ حاصل نہ ہُوا۔ صوبے کی سب سے بڑی عدالت نے ان کی اپیل کو نہایت متانت کے ساتھ سُننے کے بعد مسٹر ہربرٹ کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق کیا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں اور تین تین صورتوں میں بھی پھانسی کی سزا کو حبس بعبور دریائے شور سے بدل دیا۔

لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں ایسا

---

[1] جنگ کو مقدمہ کہا جاتا تھا۔ غدا کو قانونی ایجنٹ طلائی مہروں کو سُرخ ہیرے یا دہلی کے بڑے سنہری تحفے یا بڑے سرخ جانور طلائی مُہروں کی ادائیگی کو سرخ دانوں والی تسبیح کہتے تھے اور روپے پیسے کی ادائیگی کو کتابوں اور دوسری تجارتی چیزوں کی قیمت۔ ڈرافٹ اور منی آرڈر کو سفید پتھر اور اُن کی تعداد کو تسبیح کے دانوں سے نشاندہی دی جاتی۔ سرکاری پولیٹ پیرا نمبر ۱۴ ۱۸۷۰ء پنجاب جوڈیشل کمشنر میں اس اپیل کا فیصلہ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء

ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلاف نے کچھ سالوں کے لئے انہیں سرحد پر خاموش رکھا۔ مگر اس کے باوجود ہمارے علاقہ میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش کے ساتھ ہوتی رہی۔ مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے ہفتہ وار امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان نذرانوں کا اصلی حصہ جو سرحد پر پہنچتا اُس کے متعلق بہت سے شکوک ہیں اس لئے کہ جوں جوں روپیہ پہنچانے کے راستے میں روکاوٹیں بڑھتی گئیں اسی اعتبار سے مبلغین اُس کی زیادہ مقدار اپنے استعمال میں لانے لگے جس (کی) ان کا پرانا جوش ہرگز اجازت نہ دیتا تھا

دہانہ گنگا کے متعصب مسلمان اپنے آپ کو وہابی نہیں بلکہ فرازیؔ[1] کہتے ہیں یعنی زیادہ اعلیٰ مذہب کے پیرو۔ وہ اپنے آپ کو نو مسلم کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔ کلکتہ کے مشرقی اضلاع میں ان کی ایک کافی تعداد رہتی ہے۔ ہم اس سے پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ۱۸۳۱ء میں ایک مقامی لیڈر نے تین چار ہزار آدمیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور کلکتہ کے ملیشیا کی ایک جماعت کو شکست بھی دی تھی یہاں تک کہ باقاعدہ فوج ہی کی مدد سے اُن کو دبایا جا سکا۔ ۱۸۴۳ء میں اس جماعت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی اور حکومت کو اس کی بالخصوص

---

[1] افراز۔ بلند۔ وہ اپنی جماعت کا بانی تیتو میاں کو نہیں بلکہ شریعت اللہ کو جو ڈھاکہ میں ۱۸۲۰ء میں وعظ کیا کرتا تھا قرار دیتے ہیں۔

تحقیقات کرنا پڑی ۔ بنگال کے پولیس افسر نے رپورٹ کی تھی کہ ان کے صرف ایک واعظ نے اسی ہزار مرید جمع کر رکھے ہیں جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے اور ہر ایک کے منشا کو جماعت کا منشا سمجھتے ہیں۔ بعد کے خلفاء خصوصاً یحییٰ علی نے جنوبی بنگال کے فرزیوں کو شمالی ہندوستان کے وہابیوں میں مدغم کر دیا تھا۔ اور گذشتہ تیرہ برس سے ہم ان کو میدان جنگ کے مقتولین اور عدالتوں کے کٹہروں میں ساتھ ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۲ء تک جمع شدہ سرمایہ اور آدمی حسب دستور سرحد جاتے رہتے۔ چنانچہ اس سازش کو قابو میں لانے کے لئے ہمیں ایک علیحدہ محکمہ قائم کرنا پڑا۔ اس وقت وہابیوں کی دیکھ بھال اور ان کو اعتدال پر رکھنے کے لئے صرف ایک ہی صوبے کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا جتنا ایک انگریزی ضلع کا جس میں سکاٹ لینڈ سے ایک تہائی انسان بستے ہیں بندوبست عدالت اور جرائم پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ شرانگیزی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لئے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے اور ان کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو ان کے مرید ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ اپنے سردار سے غداری کی بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۸۶۳ء میں ہماری پولیس کی تگ ودو اور سرحد پر فوجی چوکیوں کے باوجود ان مجاہدین کی سازشوں نے حکومت ہند کو ایک اور خونریز جنگ میں دھکیل دیا جس میں ہمارا بہت سا روپیہ خرچ ہوا۔ اسی سال مالدہ کے مرکز نے بے خطر ہو کر پٹنہ کے خلیفہ کے لڑکے کو دعوت دی کہ وہ بنگال کے عین وسط میں پہنچ کر بغاوت کی تبلیغ کرے۔ روزمرہ کی عدالتی کارروائیاں اس بحران کو روکنے کے لئے بالکل بےکار ثابت ہوئیں اور حکومت کو ان اختیارات خصوصی سے کام لینا پڑا جن کے استعمال کا ایسے مواقع پر اس کو اختیار دیا گیا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں مجلس قوانین ساز نے اس خطرہ کو باقاعدہ طور پر محسوس کر لیا تھا جو ہماری ایسی حکومت کو جس کی ترکیب چند اجنبی اشخاص سے ہو مفتوح قوم کے عوام کی بھاری اکثریت سے پیش آسکتا ہے۔ اس بنا پر اس نے محکمہ منتظمہ کو سازش کے وقت گرفتاریاں کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ ایسے قومی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اگرچہ انگلستان میں (HEPEA CARPS ACT) کو ملتوی کر دیا جائے گا مگر ہندوستان میں اس التوا سے جو مصیبت نازل ہوگی وہ کسی صورت میں مارشل لا کے نفاذ سے کم خطرناک نہ ہوگی۔ مثال کے طور پر موجودہ موقع پر مسلمانوں کی صرف ایک جماعت قابل مواخذہ ہے۔ تمام مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔ اگر کوئی قانون ایسا نافذ کر دیا جائے جس سے (HEPEA CARPS ACT)

کی طرح التواہو جائے تو نہ صرف ہندو جو ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں بجا طور پر شکایت کریں گے کہ اُن کے بدترین دشمن مسلمانوں کی غداری کی وجہ سے انہیں بھی تکلیف میں ڈالا جا رہا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں شیعہ اور سُنی جماعتیں پُرزور احتجاج کریں گی کہ ان کو وہابی بدعتیوں کے ساتھ ایک ہی حکم امتناہی کے ماتحت کیوں رکھا گیا ہے۔

یہ بے انصافی ایک اور قوت کے ماتحت جس کا خوش قسمتی سے انگلستان میں رواج نہیں لیکن ہندوستان میں عام ہے اور بھی بڑھ جائے گی۔ ایک بنگالی خواہ امیر ہو یا غریب اپنے دشمن کے ساتھ بے حد کینہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لیے کسی قسم کے تشدد کو کام میں نہیں لاتا بلکہ اس کو عدالتی مقدمات میں اُلجھا دے گا۔ وہ عدالتوں کو اُس کام کے لیے استعمال کرتا ہے جس کام کے لیے ایک انگریز اپنا چابک اور کیلے فورنیا کا باشندہ اپنا پیش قبض استعمال میں لاتا ہے کسی کو ذاتی رنجش کی بنا پر سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا جائے اس لیے (HEPEA CARPS ACT) کا عام التواء شخص کو اُس کے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گا۔ ہندوستان میں پولیس کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹے مقدموں کی تعداد سچے مقدموں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے اور بنگالی تو جھوٹے مقدموں کو بظاہر سچا ثابت کرنے کے خطرناک کام کو

سائنس کے درجے پر سے گئے ہیں لہٰذا (H.C.A) کے حق کا باقاعدہ التوا اس امر کا مترادف ہوگا کہ جھوٹے مقدمات کے سلسلوں کو جاری رکھنے کا اعلان عام کر دیا جائے۔ بے گناہوں کو ہر وقت خطرہ لگا رہے گا کہ وہ قید یا بغاوت کے الزام میں جیل خانوں میں پڑے رہیں گے۔ انتقام پسند اور کینہ پرور لوگ ہمیشہ کامیاب ہوتے رہیں گے۔

پھر بھی اگر بغاوت کے وقت گرفتار کرنے کا حق اُن کے پاس نہ ہو جیسا کہ انگلستان میں ملکہ کے وزراء کو (H.C.A) کو ملتوی کرنے کا حق ہے، تو ہندوستان میں انگریزی حکومت ایک مہینہ تک بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے مجلس مقننہ نے محکمہ منتظمہ کو اس قسم کی ترمیم شدہ طاقت بطور استحقاق دے رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ایسی قیود اور پابندیاں بھی لگا دی ہیں جن کی بنا پر اس قانون کا ناجائز استعمال نہ کیا جا سکے۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اس استحقاق سے صرف حکومت اعلیٰ ہی کام لے سکتی ہے۔ اور وہ بھی اُس وقت جب اُس نے گورنر جنرل باجلاس کونسل سے منظوری حاصل کر لی ہو۔ پھر تمہید ہی میں اس قانون کے نفاذ کو صرف اُن سیاسی معاملات تک محدود کر دیا ہے۔ جن کا اثر انگریزی حکومت کے خارجہ تعلقات یا دیسی ریاستوں میں جن کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں امن و امان قائم رکھنے سے ہو یا جن کا اثر انگریزی علاقے کو کسی بیرونی حکومت کے حملے یا اندرونی بغاوت سے محفوظ

رکھنے سے ہے[1]۔ اس قسم کے قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کے لئے خاص دفعات بنائی گئی ہیں۔ قانون میں اُن کی حیثیت کو اخلاقی مجرموں سے بالکل علیحدہ کر کے دکھایا گیا ہے اور اُن کو قیدی نہیں بلکہ نظر بند کہا جاتا ہے۔ ان کو گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ اُن کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے پاس براہ راست عرضداشت بھیجنے یا مطالبہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ جو افسر ایسے شاہی قیدیوں پر متعین ہوتا ہے وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کے افسر اعلیٰ کو اطلاع دیتا رہے کہ آیا نظر بندی سے کسی کی صحت کو نقصان تو نہیں پہنچا اور اُس کا وظیفہ اتنا ہے کہ اُس کی اور اس کے اہل و عیال کی اُس کے معیارِ زندگی کے مطابق کفالت کر سکے۔ اس کی جائداد بھی عموماً اُسی کے یا اُس کے خاندان ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن اگر گورنمنٹ کے لئے ضروری بھی ہو جائے کہ اُس کی جائداد پر قبضہ کر لے تو اُسے مال گزاری کی ادائیگی یا دیوانی عدالت کی کسی ڈگری میں نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقتاً اس جائداد کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہوتی ہیں جو کورٹ آف وارڈ میں آئی ہوئی جائدادوں کو دی گئی ہیں۔ بر دستے قانون اس بات کی خوب احتیاط کی جاتی ہے کہ اُن پر خواہ مخواہ زیادہ دیر تک قیود عائد نہ ہوں۔ چنانچہ ہر افسر جو اُس شاہی قیدی

---

[1] اس سے مراد بنگال گورنمنٹ ہے جو قانون منظور کرنے وقت حکومت اعلیٰ کی قانونی اور تاریخی نمائندہ تھی

[2] ریگولیشن نمبر III سنہ ۱۸۱۸ء نمبر ۱

پر مامور ہو جس کو محکمہ منتظمہ نے نظر بند کر رکھا ہے مجبور ہے کہ اس کے چال چلن صحت اور سہولت کے متعلق براہ راست حاکم اعلیٰ کے پاس سال میں دو دفعہ رپورٹ کرے تاکہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس امر کا فیصلہ کر سکے کہ آیا اُس کی نظر بندی کے احکام جاری رہیں یا اُن میں کوئی ترمیم کر دی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ قانون اُس اتحاد کے خلاف نافذ کیا جاتا۔ جو ۱۸۵۸ء کی مہم اور اُس کے بعد تحقیقات سے معلوم ہوا تھا کہ انگریزی ہندوستان کو ۱۸۶۳ء کی تباہ کن سرحدی جنگ سے نجات مل جاتی۔ تھوڑی سی دانشمندانہ گرفتاریاں درہ امبیلا میں تقریباً ایک ہزار سپاہیوں کے قتل اور لاکھوں پونڈ کی رقم کو بچا سکتی تھیں۔ پھر اس تباہ کن جنگ کے بعد بھی اگر اُس سازش کو جو ۱۸۶۴ء کے سیاہی مقدمہ سے منکشف ہوئی تباہ کرنے کے لئے محکمہ منتظمہ گرفتار کرنے کے استحقاق کو سختی کے ساتھ استعمال کرتا تو بہت ممکن تھا کہ ہمیں ۱۸۶۸ء میں کوہ سیاہ کی مہم سے نجات مل جاتی لیکن اُن وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر میں نے کسی اور جگہ کیا ہے ہندوستان کی حکومت اپنے ارد گرد کے پیچیدہ خطرات کو خاطر میں نہیں لاتی اور اُس کی یہ عادت وقتاً فوقتاً اسے خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

انگلستان نے بہت بڑی بازی ہندوستان میں لگا رکھی ہے۔ انگریزی سرمایہ دار کروڑوں پونڈ ہر سال محض اسی ملک سلطنت کے برقرار

آیا ہے۔ ریلوں، نہروں اور دیگر منفعت بخش کاموں پر لگاتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت میں عارضی طور پر بھی فرق آگیا تو یہ ایک عظیم الشان مصیبت ہوگی۔

سرحد پر تباہ کن جنگیں اور اندرون ملک میں عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کے اتحاد کو توڑ سکیں۔ آخر ۱۸۶۴ء میں گورمنٹ نے فیصلہ کیا کہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے استحقاق گرفتاری کو سختی کے ساتھ استعمال کرے۔

یہ اقدام بے گناہوں کو ضرب پہنچائے بغیر کیا جا سکتا ہے اور اس میں عوام الناس کی طرف سے کسی قسم کی شورش کا اندیشہ بھی نہیں۔ غداروں کے سرداروں کی ضلع وار فہرست کئی سال سے حکومت کے پاس تھی اور ہندوؤں کو بھی اُن کے جلد یا بدیر گرفتار ہو جانے کی توقع تھی۔ سازش کے مشہور و معروف مبلغین کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ ساحرانہ اثرات جو انھوں نے اپنے مقلدین پر پیدا کر رکھے تھے زائل کر دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ اُن تمام خفیہ اور کمینہ غداروں کے خلاف شہادتیں جمع کر لی گئیں جو لوگ امیر تھے اور روپیہ بہم پہنچانے کا کام کرتے تھے انہوں نے ۱۸۶۴ء والے مقدمے کے فوجی ٹھیکیدار کی طرح باغیانہ خطرے کے ماتحت دلالی کا بہت ہی منفعت بخش کاروبار چلا رکھا تھا۔ میں اُن مقدمات میں سے ایک کا قصہ بیان کر چکا ہوں جو گذشتہ سال مالدہ کے مرکز اعلیٰ کے مقدمے کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت قیدیوں کا ایک گروہ

جس کو محکمہ منتظمہ نے گرفتار کیا تھا مجسٹریٹ کی باقاعدہ تحقیقات کے بعد سیشن سپرد ہو چکا ہے۔ اور ان کے خلاف پٹنہ میں قانونی کارروائی ہو رہی ہے ان گرفتاریوں اور عدالتی کارروائیوں نے آخر مسلمانوں کو اُس خطرے سے آگاہ کر دیا جو مجاہدین کی یہ جماعت تمام اہل اسلام پر نازل کر رہی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان بدبختی سازشیوں سے اپنے آپ کو باقاعدہ اور کھلم کھلا بری الذمہ ثابت کیا جائے۔ اس بنا پر ایک جماعت نے جہاد کے متعلق اپنے علما کے فتوے بھی شائع کر دیئے ہیں اور وہابی بغاوت کی مذمت کی ہے یہ عجیب و غریب دستاویزات ہمارے آئندہ باب کا موضوع ہوں گی۔ انجام کار مجاہدین کی سازش میں بھی تباہی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کے نمایاں اور سرگرم لیڈر نظر بند ہیں اور باقی ماندہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کبھی نمایاں ہونے کی کوشش کی تو ان کا بھی ویسا ہی حشر ہوگا۔ بایں ہمہ اس بہت بڑے دینی اتحاد کا مرکز ابھی تک سرحد پر قائم ہے۔ آج ہی صبح جب میں اس باب کو ختم کر رہا تھا ایک معتبر ہندوستانی اخبار نے کوہ سیاہ پر ایک اور چھاپے کی اطلاع دی ہے۔ ۴ر جون کو ایک قبیلہ کا حملہ ہوا جس نے آبادی کے سخت مقابلہ کے باوجود تین گاؤں کو جلا دیا[۲]۔ اس فساد کے

---

[۱] شملہ ۱۶ر جون ۱۸۷۱ء

[۲] پائنیر ۱۰ر جون جو ۱۲ر جون کو شملہ پہنچا

چار گھنٹوں کے اندر اندر ۳۰ پنجابی پیادہ اور ۳۴ پنجابی سواروں کے ایک حصّہ نے ہماری قریب ترین چھاؤنی سے کوچ کرنا شروع کر دیا۔ اُس کا کیا انجام ہُوا؟ اس کے متعلق ابھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ یہ حملہ مجاہدین کا تھا یا کسی اور کا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ انگریزی ہندوستان کے اخبارات کئی ہفتوں سے ایک اور افغانی جنگ کے امکانات پر بحث کر رہے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ مصیبت پھر ہماری قسمت میں لکھی ہے تو سب سے پہلے اندرون ملک میں وہابیوں کی سازش کو کلی طور پر نیست و نابود کرنا ایک بہت بڑے خطرے کو رفع کرنے کے مترادف ہوگا۔

تیسرا باب

علمائے کے فتوے

بنگال میں وہابی اپنے باغیانہ سلسلہ کی اشاعت برادران وطن کی مخالفت کئے بغیر نہ کر سکے۔ علاوہ ان دینی مباحث کے جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ایسی ہی سختی کے ساتھ جاری ہیں جیسے عیسائیوں میں وہابیوں کا کسی ضلع میں موجود ہونا بذات خود اس ضلع کے تمام مسلمان اور ہندو زمینداروں اور تاجروں کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ وہ سیاسیات اور مذہب دونوں میں انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کا کام لوتھر اور کروموبل کی طرح تعمیری نہیں بلکہ روبس پیئر اور اینٹورپ کے ٹینچلین (TANCHLIN)[1] کے کام کی طرح تخریبی ہے

---

[1] اُس کا خیال تھا کہ اُس کی جماعت ہی صحیح عیسائی تھی۔ اُس کے ارد گرد تین ہزار سپاہی جمع رہتے تھے۔ لوگ اُس کو فرشتہ سمجھ کر پرستش کرتے تھے۔ وہ اُس پانی کو پیتے تھے جس سے وہ غسل کرتے تھے میکیملن کی تاریخ لیٹن کرسچانٹی جلد ہ صہ ۲۸۹ ایڈیشن ۱۸۶۷

جس طرح اٹریشٹ (UTRECHT) کے پادری آخر الذکر مصیبت کے ظہور پر ڈر کے مارے چیخ اٹھے تھے۔ بعینہ مسلمان ملا بھی جن کی مسجد کے ساتھ ساتھ چند ایکڑ زمین یا کوئی خانقاہ[1] ضرور ہوتی ہے۔ گذشتہ نصف صدی سے وہابیوں کے خلاف پیچ وتاب کھا رہے ہیں ۱۸۱۳ء ۱۸۳۰ء کے درمیان کوئی وہابی مکہ معظمہ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر نہ پھر سکتا تھا جہاں آج بھی اسے بے عزتی اور مار پیٹ کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی زمیندار اور مذہبی رہنما منفقہ طور پر ہر قسم کے انقلاب سے ڈرتے ہیں مسلمان زمیندار ویسے ہی مسجدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جیسے انگریز زمیندار قائم شدہ گرجوں کی مسلمہ حقوق کے لئے جھگڑے کا وجود ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ ہندوستان کے وہابی دونوں پہلوؤں سے سخت انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ان کی مثال اینا بیٹس کی ہے اور (فقہ منار کی) ملوکیت پنجم کے ہواخواہوں اور جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے اشتراکی اور سرخ جمہوریت کی۔ انہوں نے ابتدا ہی سے ان مسلمانوں کی اچھی طرح خبر لی ہے جو ان کے عقاید کی مخالفت کے جرم کے مرتکب ہوئے چنانچہ ۱۸۲۷ء-۳۰ء میں ان کا روحانی امام پشاور کے سخت گیر گورنر کے خلاف

---

[1] عام طور پر یہ ایک خانقاہ ہوتی تھی جس کے ساتھ کچھ زمین نیک کاموں کے لئے وقف کی جاتی تھی۔

اُسی سختی سے برسرِ پیکار رہا جیسے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف ۱۸۳۱ء میں کلکتہ کے گرد و نواح میں جو بغاوت ہوئی اس میں یہ لوگ بلا امتیاز ہندو اور مسلمان زمینداروں کے گھروں میں گھس گئے اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمان زمینداروں کو کہیں زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لیڈروں کی عادت تھی کہ بعض اوقات اپنے کسی بدعقیدہ ہم مذہب کی لڑکی کو بدعات سے نجات دلانے کے خیال سے زبردستی اُٹھا کر لے جاتے اور اپنے کسی ڈاکو سردار سے اُس کا نکاح کر دیتے۔ پندرہ سال کے بعد اس جماعت کے متعلق بیان تھا کہ یہ گروہ[1] اسی ہزار اشخاص پر مشتمل تھا۔ ان میں کامل اخوت پائی جاتی تھی اور وہ ادنےٰ طبقہ کے لوگوں سے بھرتی کئے گئے تھے۔ یہ امر ہر شریف زمیندار کے لئے بہت بڑی پریشانی کا موجب تھا۔

اس قسم کے متعصب مذہبی لوگ سرمایہ دار قوم یا آرام پسند جماعتوں کے نزدیک بھی کسی قسم کی حمایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ مگر بنگال کی ایک خاص تجارت (جس میں بہت زیادہ کاروبار ہوتا ہے اور جسے بہت بڑا اثر حاصل ہے) ہمیشہ ان کی پشت پناہی کرتی رہی۔ ہندو قصابوں اور چرم فروشوں کو بہت بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ناپاک ہاتھ سے گائے ایسے پوتر جانور کے مردہ جسم کو مس کرتے اور اس کی موت سے فائدہ حاصل کرتے

---

[1] مسٹر ڈیمپیر (بنگال کے پولیس کمشنر کے خطوط جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے)

ہیں۔ ایسا انسان مادرزاد بھرشٹ اور مہذب سوسائٹی سے خارج تصوّر ہوگا وہ دولت کی کثرت یا اپنے نفرت انگیز پیشہ کی کامیابی کے باوجود کوئی عزت حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک سچے ہندو کی طرح اُسے اپنی اس ذلیل حیثیت کو بے چون وچراں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کی معاشرتی حیثیت کو اونچا کرنے میں کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ اُس نے اس قسم کی کوشش کبھی کی ہی نہیں۔ وہ لاکھ دیانتدار اور نیک ہو اُس کے ہمسایوں کے دل میں اس کے لئے تعریف وتحسین کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ اندریں حالات وہ ان اوصاف کی سرے سے پرواہ نہیں کرتا۔ اگر گاؤں کی گائیں اتنی تعداد میں مرتی رہیں جس سے اس کو چمڑے کی مطلوبہ مقدار حاصل ہوجائے تو نہما ورنہ سنکھیا اُن کی شرح اموات کو پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس قسم کا ناکارہ انسان خوردہ فروشی سے زیادہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اس لئے چمڑے کی تھوک فروشی کا کاروبار (جو ہندوستان کی ایک بہت بڑی تجارت ہے) مسلمان تاجروں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے مسلمان اُن جذبات سے مطلق اعتنا نہیں کرتے جو اس متبرک جانور کی کھال کی تجارت سے ہندوؤں کے دلوں میں برانگیختہ ہوجاتے ہیں۔ چمڑے کے مسلمان تاجر ہندوستان کے بہت بڑے مالدار اور تاجر قوم ہیں لیکن ہندو ان کو انتہائی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کا خمیازہ ان کو ایک دوسری شکل میں اُٹھانا پڑتا ہے۔ یہ مسلمان تاجر خوب جانتے ہیں

کہ اگر برہمنوں کو تھوڑی دیر کے لئے بھی غلبہ حاصل ہو گیا تو سب سے پہلے وہی ان کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنیں گے۔ لہٰذا وہ ہندو کفار کو اپنا دلپسند شکار سمجھتے ہیں اور وہابیوں کے نہایت طاقتور اور مالدار پشت پناہ بن گئے ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کفار کے خلاف جہاد کریں۔

مگر وہابی اپنی طاقت و اثر کے لئے کسی ایک جماعت کے دست نگر نہیں ہیں خواہ وہ جماعت کیسی ہی طاقتور اور مالدار کیوں نہ ہو۔ وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام الناس میں تبلیغ کرتے ہیں ان کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی امید وبیم کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں اُن میں ہزارہا اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعتہً بڑے ہی متقی اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں اور یہ انہیں کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بڑی عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بہترین وہابی وہ ہے جو نہ کسی سے ڈرے نہ کسی پر رحم کھائے۔ اُس کی زندگی کا راستہ صاف ہے۔ کسی قسم کی تہدید یا تشدد اُس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی بنگال کے جیل خانہ میں ایک بہت ہی بزرگ اور سفید ریش انسان قید ہے جس کا دامن زندگی کی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے بجز اس کے کہ وہ بہت ہی سخت

اور مستقل غدار واقع ہوا ہے۔ حکومت کو تیس سال سے اُس کی ان باغیانہ سرگرمیوں کا علم تھا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ حکومت اس کے کارناموں سے بے خبر نہیں ۱۸۴۹ء میں اسے باقاعدہ تنبیہ کیا گیا تھا ۱۸۵۳ء اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں بھی اسے پھر تنبیہ کی گئی تھی۔ آخر ۱۸۶۴ء میں وہ مجسٹریٹ کی کھلی عدالت کے سامنے طلب ہوا تاکہ اس کو آخری مرتبہ سرزنش کردی جائے لیکن اُس کے لئے تمام پند و نصائح بیکار ثابت ہوئے حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اُسے نظر بند کرنا پڑا۔ اس قسم کے افراد کے معاملہ میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حکومت انہیں جو راسخ العقیدہ ہوں اور اپنے اعتقادات کے مطابق صالح اور پاک باز بھی انتہائی سزا دینے سے اجتناب کرے۔ ان کے متعلق شاید بہتر ہے کہ تھوڑی سی قیود کے ساتھ نظر بند کر دیا جائے تاکہ وہ دوسروں کو ورغلا نہ سکیں۔

وہابی عقیدہ کا اختیار کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اوّل تو جو شخص اس مذہب کا پیرو ہوگا اس کو سالانہ بہت سا مال اُس کی امداد کے لئے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ پھر اگر کوئی اس میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لے اور سرحدی کیمپ میں داخل ہو جائے تو اُس کو اس سے بھی دشوار تر حالات پیش آئیں گے۔ میں نے اُن شہادتوں سے زیادہ اور کوئی قابل رحم شے نہیں پڑھی جو اُن رنگروٹوں نے گذشتہ مقدمات کے دوران میں دیں تھیں۔ ججوں کے فیصلے سے ظاہر ہوتا

ہے کہ وہابی مبلغین مشرقی بنگال کے تقریباً ہر ضلع سے سینکڑوں بہکائے ہوئے نوجوانوں کو جن کی عمر بالعموم بیس برس سے بھی کم تھی اُن کے والدین کی اجازت کے بغیر یقینی تباہی کی طرف لے گئے۔ انہوں نے ہزاروں کسان گھرانوں میں مصیبت اور غم کی لہر دوڑا دی اور کسان آبادیوں میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو اپنے ہونہار نوجوانوں کے متعلق دائمی تشویش میں مبتلا نہ ہو۔ کسی وہابی باپ کو اس کا علم نہ تھا کہ اُس کا پاک باز اور تنومند لڑکا کب اچانک گاؤں سے غائب ہو جائے گا۔ ان نوجوانوں میں سے جو اس طرح راہ فرار اختیار کرتے اکثر متعدی امراض، قحط اور تلوار کے گھاٹ اُتر جاتے اور جو اُن میں سے واپس آتے وہ اس یقین کے ساتھ کہ انہیں محض قربانی کا بکرا بنایا گیا اور وقت گذرنے پر اُن سے بے اعتنائی برتی گئی۔ یہاں اُس شخص کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جس کو اس مہم میں کم سے کم مصائب برداشت کرنا پڑے۔

میں پٹنہ کے خلیفہ کا مرید ہوں۔ دس بارہ برس کی عمر میں رام پور لولیار (جنوبی بنگال میں ایک قصبہ ہے گواہ کے گاؤں کے پاس) میں اُن کے یہاں تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ میرے استاد جہاد کا نقشہ تیار کر رہے تھے اور روپیہ اور آدمی بھیجنے کے انتظام میں مصروف تھے۔ جب میری عمر پندرہ سال کی ہوئی تو مجھے بھی جہاد میں حصہ لینے کے لئے سرحد بھیج دیا گیا۔ ہم نے یہ سفر پٹنہ اور دہلی کے راستہ طے کیا (جو سرحدی کیمپ سے تقریباً دو ہزار میل

کے فاصلہ پر ہے) میں پٹنہ میں خلیفہ صاحب کے پاس صرف ایک رات ٹھہرا۔ دہلی میں میرے ساتھی تو آگے چلے گئے لیکن میں ایک عالم کے پاس ڈیڑھ سال اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد جب ایک گروہ سرحدی کیمپ جاتے ہوئے دہلی سے گذرا تو میں بھی اُن کے ساتھ گجرات تک چلا گیا تھوڑی مدت کے بعد وہاں ایک گروہ اور پہنچ گیا اب میں اُن کے ساتھ پہاڑوں پر چلا گیا۔ یہاں پر مجھے یقین دلایا گیا کہ امام سید احمد صاحب نے دوبارہ ظہور فرمایا ہے۔ میں نے وہاں آٹھ نو ہزار کے آدمیوں کے مجمع کو دیکھا۔ ان کا سردار میرا وہ استاد تھا جس کے پاس میں اُس وقت پڑھا کرتا تھا۔ جب میری عمر بارہ برس کی تھی۔ وہ اب پٹنہ کا خلیفہ منتخب ہوا ہے لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ کسی امام نے ظہور نہیں کیا اور یہ سب کچھ محض دھوکہ ہے۔ اس پر میں اور بعض دوسرے آدمی ناراض ہو گئے اور دہلی واپس چلے آئے۔ کچھ دنوں بعد ایک عرب دہلی آیا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ امام صاحب ستیانا میں ظاہر ہو گئے ہیں حتیٰ کہ اس نے مجھے جہاد میں شرکت کے لئے آمادہ کر لیا جب میں ستیانا پہنچا تو امام صاحب کے ظہور کے متعلق پھر دریافت کیا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ لہذا مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ہمیں پھر دھوکہ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریزی سپاہ ہم پر حملہ آور ہو رہی تھی تو میں دہلی بھاگ گیا اور پھر اپنے گھر چلا

آیا سلہ

یہ اُس رنگروٹ کی کہانی ہے جس کی بہت دیکھ بھال کی گئی اور جو صحیح سلامت واپس آگیا تھا۔ میں اُن بد قسمت انسانوں کی تکلیف دہ حکایات کو بیان کرنا نہیں چاہتا جو راستہ ہی میں سردی یا غربت کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ صرف ایک ہی مجاہد کا سرحد سے واپس آجانا اپنے اپنے ضلع میں وہابی تحریک کی تباہی کے لئے سیاسی مقدمات سے بھی کہیں زیادہ کارگر ہے۔ اس کی موجودگی ان متعصب نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیتی ہے جو بھرتی ہونے پر مصر ہوں۔ کئی ایک سچے وہابی قانون کی ان تاویلات کو سننے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں جو اُن کو باغیوں کے حقوق سے سبکدوش کر سکے۔

پچھلے دو سال سے بنگال میں اس قسم کی تاویلات کی بہ کثرت اشاعت کی گئی۔ وہابی مبلغین نے عوام الناس کو اس رو میں بہائے جانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مصارف جہاد کا بوجھ بھی اپنے تمام ہم وطنوں کے کندھے پر ڈال دیا ہے۔ اب اُس شخص کے لئے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنا ہو بڑی مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ یا تو وہ اس خطرناک سازش میں شریک ہو جائے یا کافر کہلائے کچھ عرصہ تک تو اس تحریک میں چندے کی امداد سے اس کی شخصیت کو کوئی

سلہ یہ خلاصہ ہے گواہی کا جو اُس نے دیناپور کے مجسٹریٹ کے سامنے ۱۵ اگست ۱۸۶۵ء کو دی جہاں تک ممکن تھا میں نے اصل نام کو ظاہر کرنے سے احتراز کیا ہے۔

نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ مگر جب سے محکمہ منتظمہ کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کو گرفتار کرے باغیوں کی مدد کرنا ایک خطرناک جرم متصور ہوتا ہے لہذا اس خطرے میں صرف وہی لوگ پڑتے ہیں جو ازحد متعصب ہوں مستورات سے چندہ بہت کم ملنے لگا ہے اور وہ اُمراجن کا کاروبار ملک میں بہت زیادہ پھیل گیا ہے جہاد کے لئے مسجدوں میں چندہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہابی جماعت کے متعصب آدمیوں نے اُن لوگوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ بڑھادی ہے جس کے ماتحت اہل زر دین و دنیا دونوں کی خدمت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو دولت مند اور خوشحال مسلمان ان نالائم الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہتے مگر تمام مسلمان ملاؤں کی طاقت اُن کی پُشت پر تھی۔ رفتہ رفتہ اُنھوں نے اپنی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ایک علمی بحث کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے توانھوں نے وہابیوں کے اصول جہاد پر ہی اصولی اعتراضات شروع کر دیئے اور اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ملکہ معظمہ کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہیں۔ پچھلے چند سال کے فتوے انہی کی طرفداری میں شائع ہوئے حتیٰ کہ مکہ معظمہ کے تین سب سے بڑے مفتیوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملکہ انگلستان کے خلاف بغاوت کرنے

کے خطرناک فرض سے آزاد کریں[1]۔

اگر ہم اصل حقیقت تک پہنچنا چاہیں تو بہت کافی غور و خوض کی ضرورت ہو گی۔ قرآن مجید کا کہنا صاف صاف یہ ہے کہ مسلمان تمام دنیا کو فتح کر لیں گے۔ اس کے بعد اقوام عالم کے لئے دو ہی راستے ہوں گے تبدیلیٔ مذہب یعنی ایسی فرمانبرداری کا اختیار کرنا جو غلامی کی حد تک پہنچ جائے اور یا موت۔ لیکن قرآن موجودہ قومی ضرورت کے مطابق تو لکھا نہیں گیا تھا بلکہ عربوں کے جنگجو قبائل کی اُن مقامی ضروریات کے مطابق جو اول مظلومانہ ثانیاً قابو چیانہ اور پھر فاتحانہ حیثیت سے پیش آتی رہیں (نقل کفر کفر نباشد۔ (مترجم) قرآن مجید کی جنگ جو اور متعصبانہ ذہنیت کو مابعد کے علما اور شارحین نے بہت کچھ کم کرتے ہوئے اُس کے یک طرفہ پرجوش تعصب سے ایک ہمہ گیر نظام حکومت قائم کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی جہاد کے متعلق رسول اللہ کے بہت سے احکام شرع اسلامی میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے آ گئے ہیں۔ ہندوستان کی مستند کتاب "ہدایہ" میں کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے فرائض اور ہدایات کے لئے ایک جُداگانہ باب موجود ہے اور شرع اسلامی کے ہندوستانی علما نے اس کی ضرورت و اہمیت پر بہت زور دیا ہے مگر پچھلے دنوں مسلمانوں میں جن مباحث

---

[1] حنفی۔ شافعی اور مالکی مذہب کے مفتی۔ چوتھا فرقہ حنبلی ہے۔ مگر وہ مکہ معظمہ میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اور اُن کا کوئی امام نہیں۔

کی بنا پر اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اُن کا قرآن مجید میں کہیں ذکر نہیں آتا لہذا تمام جماعتوں نے خاموشی کے ساتھ اس سوال کے متعلق قرآن مجید سے قطع نظر کرکے اس کی بنیاد صرف قانون شریعت پر رکھی جو خود قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔

یہ بات ہمارے لئے اور مسلمانوں کے لئے باعث مبارک باد ہی کہ جو فتوے بھی دیئے گئے امن اور وفاداری کے حق میں دیئے گئے۔ اگر یہ اگر یہ فتوے بغاوت کے حق میں ہوتے تو اُن کی وجہ سے ایسے ایسے خطرات پیدا ہو جاتے جن کے متعلق مبالغہ سے کام لینا ناممکن تھا۔ مسئلہ جہاد کی بحث ہی اس امر کو صاف طور پر واضح کر دیتی ہے کہ ہندوستان میں ہماری حکومت کیسی خطرناک بنیادوں پر قائم ہے کیونکہ یہ بات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جب کبھی کوئی ایسا فتویٰ حکومت کے خلاف شائع ہُوا تو اس کا نتیجہ دنیا کی سخت ترین اور نہایت خونریز بغاوتوں کی صورت میں ظاہر ہُوا۔

علمائے جونپور کے اس فتویٰ نے کہ اکبر کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے اس زبردست بادشاہ کے شاہانہ جلال کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس وقت بنگال میں فوجی بغاوت رونما ہوئی تو اسی فتوٰی کی بدولت جس سے جنوبی بنگال کے متعدد زمینداروں کو رعیت کی بجائے جاگیردار تسلیم کیا گیا۔

یورپ میں جب کبھی باب عالی کو بلغاریہ یا کسی دوسرے صوبے میں جو آسٹریا کی سرحد پر واقع تھے فوج کشی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُس نے بھی اپنے فوجیوں کے جوش وخروش کو بڑھانے کے لئے ایسے ہی فتووں سے کام لیا جن میں کافروں کے خلاف جہاد کے فرائض اور اس کے انعامات مرقوم ہوتے۔ خود ہمارا عیسائیوں کا طرز کار بھی یہی تھا۔ جنگ ہائے صلیبی کے آخری دور میں متبرک رومن سلطنت کے جوش وخروش کو بڑھایا گیا تو اسی قسم کے حیلوں سے اسلامی ممالک میں اس قسم کے شرعی فتووں کو کافروں کے تباہ کرنے کے لئے ایک نہایت اہم قانونی فیصلہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو ان قوانین کا مجموعہ بڑی آسانی سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ پھر ابھی تھوڑی ہی مدت ہوئی جب مصر کے پاشا اور سلطان ترکی کو ان مذہبی باغیوں کے ساتھ خونریز جنگ کرنا پڑی جن کا عقیدہ یہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا عمل شرع محمدیؐ کے خلاف ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ایسے کافر خلیفہ اور اس کی فوج کو تباہ و برباد کردیں۔ لہذا یہ بڑا ہی مبارک واقع ہے کہ جس ضلع[1] سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتوےٰ شائع ہوا تھا اُسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کردیا جس کا فتوےٰ انگریزی حکومت کے خلاف

---

[1] جون پور

بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے[1]۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس سوال کے مختلف نتائج کو بالاختصار بیان کروں جس پر مسلمانوں کے دو بڑے فرقے شیعہ و سُنی گزشتہ چند مہینوں میں پہنچ سکے ہیں۔

شیعہ حضرات نے حسب عادت ایک مومن کے لئے ملکہ کے خلاف فرائض جہاد کے متعلق دوسرے امور کی طرح ایک بالکل ہی نئی راہ اختیار کی ہے۔ یہ اُس جماعت کے خیالات ہیں جس کی تعداد ہندوستان میں بہت ہی کم ہے اور جس نے متعصب مسلمان حکمرانوں کے ماتحت ایسی ایسی اذیتیں اٹھائیں جو کسی برطانوی حکمران کے ماتحت کبھی ممکن نہ تھیں۔ انہوں نے جہاد کے مضمون پر کچھ دن ہوئے ایک چھوٹا سا رسالہ فارسی زبان[2] میں شائع کیا تھا۔ گو سنیوں کے نزدیک جو ہندوستانی مسلمانوں کا $\frac{9}{10}$ حصہ ہیں اس رسالے کی کوئی وقعت نہیں۔ بہرکیف یہ فیصلہ چونکہ ایک جید اور مستند شیعہ عالم کا ہے اور اسے جماعت کے دوسرے علما کے صلاح و مشورے سے لکھا گیا اس لئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شیعوں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہیں بایں ہمہ انہوں نے ہندوستان

---

[1] مولوی کرامت علی کا لیکچر جو انہوں نے ۲۳ر نومبر سنہ ۱۸۷۰ء کو محمڈن لٹریری سوسائٹی میں پڑھا۔

[2] لفظ جہاد کا مفہوم جو شیعہ فرقہ سمجھتا ہے۔ منشی امیر علی خاں بہادر کلکتہ سنہ ۱۸۷۱ء

کی تاریخ میں بہت سے نامور پیدا کئے۔ پھر یہ جو چار سال سے ہر ضلع میں بغاوت کی فرضیت کی بحث ہو رہی ہے اس میں بھی ان کی آواز کچھ کم بے اثر نہیں۔

شیعہ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے بارہ اماموں پر ایمان لانا جو رسول خدا کے الہامی جانشین ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے ایک امام کی آمد باقی ہے جو ابھی تک ان گنہگار دنیا داروں کی نظروں سے پوشیدہ ہے جب تک اس کا ظہور نہیں ہو جاتا دنیا بدستور مصیبت اور تکالیف میں مبتلا رہے گی اور شیعوں کو بے دین سنیوں، عیسائیوں اور دیگر لامذہبوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں پہنچتی رہیں گی۔ آخر جب امام موعود کا ظہور ہوگا تو اس وقت تمام خرابیوں کی اصلاح ہو جائے گی اور ساری دنیا اس خدائی مذہب کو قبول کر لے گی۔

چنانچہ شیعوں کا یہ رسالہ بحث جہاد کے ضمن میں آگے چل کر کہتا ہے کہ اُس وقت تک کسی قسم کی انسانی جد وجہد، بغاوت یا جنگ اس عظیم الشان مقصد کے حصول میں بے سود رہے گی۔ اس رسالہ کے نزدیک ہر وہ شخص بدعتی ہے جو اس عقیدہ سے اتفاق نہیں کرتا۔ آج کل بعض بے وقوف اور شورش پسند اشخاص جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم[1] سے بالکل درک نہیں اور

---

[1] شورہ لے

حقیقت سے ناواقف ہیں محض فضول خواہشات کی بنا پر ایک ابلہانہ طریقہ سے فرائض جہاد اور اُس کے معنی و مفہوم سے بحث کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کے صرف دو فرقے راسخ العقیدہ ہیں ایک شیعہ اور دوسرے سنی مسلمانوں کے باقی فرقے خواہ وہ اپنے آپ کو وہابی کہتے ہوں یا رافضی، راہ راست سے بھٹکے ہوئے اور اس لئے ناقابل اعتماد ہیں۔ رسالہ مذکور میں لفظ جہاد[۵۱] کے تین معنے بتلائے گئے ہیں اور پھر اس کے لئے سات شرطیں مقرر کی گئی ہیں۔ جن کے اتمام پر جہاد کفار سے مذہبی جنگ کے معنوں میں جائز ہو جاتا ہے اول جب کہ سچا امام موجود ہو اور وہ اُس کی اجازت دے۔ دوسرے جب سامان حرب اور آزمودہ جنگ جو مکملا تیار ہوں تیسرے جب اُسے باغیوں اور خدا کے[۵۲] دشمنوں کے خلاف اختیار کیا جائے۔ چوتھے جو امیر جہاد عقل سلیم رکھتا ہو پاگل نہ ہو نہ اُس کے حوش و حواس میں کوئی فرق آیا ہو اُسے بیمار بھی نہیں ہونا چاہئے، نہ اندھا لنگڑا۔ پانچویں یہ کہ وہ اپنے والدین سے اس کی اجازت حاصل کر چکا ہو۔ چھٹے یہ کہ وہ مقروض نہ ہو اور ساتویں اُس کے پاس اتنا مال

---

۵۱ جہاد بمعنی نلاح۔ خدا کی حمد و ثنا (ب) جہاد بالنفس امارہ خواہشات کو قابو میں لانا اور ان کو عقل کے ماتحت رکھنا تاکہ ان کو ٹھیک راستہ پر لگائے گناہ سے بچائے اور وقت کو فضول ضائع نہ کرے (ج) جہاد فی الدین کافروں کے خلاف جنگ۔

۵۲ حربی کافر۔

ہو کہ زادراہ اور اپنے خاندان کی روزی کا کفیل ہو سکے۔

ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کی معقولیت سے قطع نظر اور اُس جنگ میں فتح و شکست کے مواقع سے اغتنانہ کرتے ہوئے بھی شیعوں کے نزدیک جہاد کے لئے امام کا موجود ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس امام من اللہ نے آج تک ثانی انسانوں کی نظروں سے پوشیدگی اختیار کر رکھی ہے اور اس بات پر رضامند ہی نہیں ہوتے کہ ظاہر ہو کر دینداروں کی فوج کی قیادت کریں لہٰذا اُن کے ظہور تک جہاد کی کوشش بھی گناہ اور گستاخی میں داخل ہے۔ رسالہ مذکور میں صاف صاف لکھا ہے کہ امام معصوم کب ظاہر ہو گا اس کا علم سوائے خدائے علیم کے اور کسی کو نہیں۔ اُس امام کی ذاتی قیادت کے بغیر خونریزی کرنا شیعہ عقائد کے خلاف ہے، جو شخص امام کے خدائی حکم کے بغیر خروج کرتا ہے وہ باغی اور گنہگار ہے۔

یہ آخری فقرہ ایک طرح سے سنیوں پر چوٹ ہے کیونکہ انہوں نے پیچھے امام کی عدم موجودگی میں کئی بار جہاد کا اعلان کیا۔ شیعوں کو ان سے بہت سی ایذاؤں اور شہداء کا انتقام لینا ہے۔ پھر یہ چھپتا ہوا فقرہ کہ آخرکار تمام دنیا مسلمان ہو جائے گی ظاہر بڑا معصومانہ اور دیندارانہ خواہش پر مبنی ہے لیکن فرقہ ثانی کے لئے حقیقتہً بہت ہی تکلیف دہ۔ ہندوستان کے شیعہ و سنی دونوں کو غلبۂ دین ہو ایمان ہے مگر اس میں تھوڑا اختلاف بھی ہے۔ سنیوں کا ایمان ہے

کہ وہ رسول اللہ کے جملہ احکام کی کاملاً پیروی کرتے ہوئے ساری دنیا کو اسلام کا مطیع کرلیں گے۔ برعکس اس کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ سعید گھڑی دنیا کے دو بڑے مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت کے باہم مدغم ہونے سے رونما ہوگی۔ آخری زمانے میں تمام دنیا کا ایک ہی مذہب پر قائم ہوجانے کا خواب ہر اپنے مذہب نے دیکھا ہے۔ ہندوؤں میں بھی آئندہ واقعات کے متعلق ایک کتاب[1] ہے جس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تمام انسانوں کا ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی ذات وشنو پران میں بھی جو ہندو کی بدھ مت پر فتح کے وقت تصنیف ہوا یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ عہد آئینی کے آخر میں جس میں ہم پہنچ چکے ہیں انسانوں کی نجات اُن کے مذہب یا اُن کی خوبی اعمال پر۔ شیعہ مسلمانوں کے یہاں بھی ایک ایسا ہی باسعادت وقت مقرر ہے مگر یہ عیسائیوں کے ساتھ جو رب کے سب شیعہ ہوجائیں گے باہمی اتحاد کے بعد رونما ہوگا۔ یہ وقت غالباً بے دین سنیوں کا خون بہانے کے بعد آئے گا۔ کیونکہ وہ اوّل اوّل امام آخرالزمان کو ماننے سے انکار کردیں گے۔ آگے چل کر اس رسالہ میں لکھا ہے کہ اسلامی قوانین میں صاف صاف مرقوم ہے کہ جب یہ امام ظاہر ہوگا تو اُس وقت حضرت عیسیٰ بھی چوتھے آسمان سے نازل ہوجائیں گے نیز یہ کہ ان دونوں عظیم الشان ہستیوں میں دشمنی نہیں بلکہ دوستی ہوگی۔

---

[1] بھاوشیش پورنا۔

بہرحال اس بات کا علم تسلی بخش ہے کہ ہماری مسلمان رعایا کا ایک چھوٹا سا طبقہ اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کی رو سے ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور نہیں۔ دوسرے مسلمان کچھ بھی کریں ہندوستان کے معدودے چند شیعہ مسلمانوں کا اعلان ہے کہ وہ محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہمارے سامنے ہمیں قتل یا غلامی کی شرمناک صورتیں پیش نہیں کر سکتے۔ یہ وعدے تو بیشک اس قابل ہیں کہ ان پر خوشی کا اظہار کیا جائے لیکن میں اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ تقیہ شیعوں کے اصول دین میں داخل ہے جس سے ہر وہ معاہدہ جو وہ حضرات ہم کافروں سے کریں مستحکم ہونے کی بجائے کمزور ہو جاتا ہے۔ ایران کے سوا شیعہ دنیا کے ہر حصے میں مظلومانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے مظلوم فرقوں کی طرح انہوں نے بھی اجتہاد کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس سے وہ اپنی جانوں کو بچا سکیں۔ خواہ ایک اجنبی کے سامنے انہیں اپنے دین سے دست برداری کیوں نہ اختیار کرنی پڑے۔ جب سنی مسلمان اُن کو مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں تو شیعہ اپنی مذہبی خصوصیات کو فوراً ترک کر دیتے ہیں۔ بعض سخت مصیبتوں میں جیسا کہ پچھلے دنوں شام اور وقتاً فوقتاً ہندوستان میں پیش آتی رہیں انہوں نے اصول تقیہ کے ماتحت اپنے عزیز ترین اصولوں کو خیرباد کہہ دیا حتیٰ کہ بارہ اماموں کو گالیاں دینے لگے لیکن انگریزی حکومت کے ماتحت اُن کو ان مظالم سے نجات مل چکی ہے اور اس لئے اُس بے وفائی کا خطرہ بھی نہیں رہا جو ان مظالم کا قدرتی نتیجہ ہے بغاوت

کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہُوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آگیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابل اعتماد شیعہ علما کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہندو یا کسی دوسرے مسلمان فرقے نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کر لیا تو شیعوں کے لئے پھر وہی مصیبت کے دن شروع ہو جائیں گے۔ سُنی مُسلمان اپنی فتحمندی کے وقت اُس فتوے کو فراموش نہیں کریں گے جو سابق شاہ اودھ کے محل سے شائع ہُوا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ اسلام کو آخری فتح مسلمانوں اور عیسائیوں کے اتحاد سے حاصل ہو گی۔ لہٰذا اس خلش کی یاد جو اس شیعہ رسالہ سے ان کے وہابی اور سُنی ہموطنوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے گی۔ سابق بادشاہ اودھ اُس فریق کی وفاداری کو جس کا اسے نمائندہ تصوّر کرنا چاہیئے چار چاند لگا دے گی۔

اب میں مُسلمانوں کے دوسرے بڑے فرقے کے باقاعدہ فتووں کا ذکر کرتا ہوں۔ ہندوستان میں سُنی ہندوستانی مُسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عرصہ سے اس اعلان میں نمایاں حصّہ لے رہے ہیں کہ ہم پر مذہباً بغاوت کا کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے دو قسم کے فتوے حاصل کئے ہیں۔ کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی نے اس مسئلہ پر

تمام سُنیوں کی رائیں ایک زوردار رسالہ کی شکل میں جمع کردی ہیں۔ میں اُن لوگوں کو یہ چھوٹا سا رسالہ پڑھنے کی تاکید کرتا ہوں جنہیں بنگالی مسلمانوں کی دماغی قابلیت پر شک ہے یا جو ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری حکومت کے ماتحت عدالتی منصبوں پر فائز ہونے کے قابل نہیں۔ یہ رسالہ اُن کی قانونی موشگافیوں کی ایک فتح ہے۔ اس میں دو مختلف مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جن کی ابتدا اگرچہ دو متضاد نظریوں سے شروع ہوتی ہے لیکن جن سے انسان ایک ہی خاطر خواہ نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ شمالی ہند کے علماء ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے لئے جہاد غیر ضروری ہے۔ کلکتہ کے علمانے ہندوستان کو دارالسلام تصور کیا اور اس بنا پر جہاد کو ناجائز قرار دیا۔ یہ نتیجہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ضرور تسلی بخش ہوگا۔ کیونکہ اس سے وہ مجاہدین کے کیمپ کے لئے جو ہماری سرحد پر قائم ہے چندہ دینے کی مصیبت سے بچ جائیں گے اور وہ ہمارے لئے بھی اتنے ہی باعث تسکین ہے کیونکہ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شریعت اور علما دونوں کی وفاداری کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور بغاوت کے لئے بھی۔[له]

له اس رسالہ کا عنوان ہے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۸۷۰ء بروز بدھ کی روداد۔ سید مولوی کرامت علی جونپوری کا ایک لیکچر ہے اور اس کا موضوع اسلامی شریعت ہے یعنی انگریزی ہندوستان میں مسلمانوں پر حاکم قوم کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

مگر بدقسمتی سے اس قسم کے فتووں کا وجود ضروری ہے تو دولت مند اور خوشحال مسلمانوں کی بجائے متعصب عوام کے لیے ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن کے ماتحت حکومت کو گرفتاری کے اختیارات حاصل ہیں اور وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ دور دراز تک پھیلی ہوئی باغیانہ سرگرمیوں کا پورے طور پر مقابلہ کر سکے جو گذشتہ بیس سال سے بنگال میں جاری ہیں اور جن کی وجہ سے وقتاً فوقتاً پنجاب کی سرحد پر لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ ان اختیارات کی رو سے کسی باغیانہ سرگرمی میں محض سرسری حصہ لینا بھی ایک خطرناک جرم ہے۔ بحالت موجودہ تو سارشتوں کا مالدار گروہ خوش ہے کہ اسے اس کام سے کنارہ کشی کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا ہے یہ لوگ اس فتوے کا یقیناً خیر مقدم کریں گے جس نے اُن کو اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا راستہ دکھلایا ہے انہیں اس کے جواز و عدم جواز کے متعلق مزید چھان بین میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کے دُکھے ہوئے دلوں کے لئے بمنزلہ پیغام شفا ہے۔ انہیں کیا پڑی ہے کہ اس مفید دوا کے مختلف اجزا کے بارے میں تکلیف دہ سوالات کریں لہٰذا کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی اپنے ابنائے وطن اور ہمارے دونوں کے شکریہ کی مستحق ہے۔ سوسائٹی مذکور کے سکرٹری خاں بہادر مولوی عبداللطیف کے ہم اور بھی ممنون ہیں کہ اب کوئی سُنی مسلمان خواہ ہندوستان کی مذہبی حیثیت کے متعلق اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اپنے ہی اصولوں کی رو سے یہ نتیجہ قائم کرے گا کہ وہ ہماری حکومت کے خلاف بغاوت

کرنے پر مجبور نہیں۔ اگر اس کے خیال میں کہ ہندوستان اب تک دارالاسلام ہے تو اُس کو صفحہ چھ کھول کر دیکھ لینا چاہئیے کہ محض اس بنا پر اس کا ملکہ کے خلاف بغاوت کرنا ناجائز ہے۔ لیکن اگر اس کے نزدیک ہندوستان دارالحرب بن چکا ہو تو اُسے چاہئیے کہ صفحہ گیارہ کا حاشیہ ملاحظہ کرے جس کی رو سے اسے معلوم ہو جائے گا کہ بغاوت غیر ضروری ہے[۱]۔

سطور بالا سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مولوی عبداللطیف صاحب کی خدمت کو کسی طرح کم کر کے دکھاؤں جو انہوں نے اس رسالہ کی اشاعت سے سرانجام دی ہے مگر یہ ہماری سیاسی غلطی ہو گی کہ کسی چھان بین کے بغیر آنکھیں بند کئے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کی رائے کو تمام ہندوستانی مسلمانوں کی رائے تسلیم کر لیں۔ وہابیوں کے پرجوش انتہا پسند تو اس قسم کے دلائل سے مطلق اعتنا نہیں کرتے لیکن دیندار مسلمانوں میں بھی ایک بہت بڑی تعداد ایسی موجود ہے جس کی خواہش ہو گی کہ مذہبی قوانین کی کسی مستند تشریح کو اپنے لئے دلیل راہ بنائے۔

---

[۱] اس باب میں اور کسی دوسری جگہ میں نے اپنے ان سابقہ مضامین سے مدد لی ہے جو کلکتہ کے انگلش مین میں شائع ہوئے اور جن کے لئے میں پچھلے سات سال کے مختلف ایڈیٹروں کا ممنون ہوں۔ وہ میرے مضامین کو جو بہت زیادہ تعداد میں ہوتے تھے اور جن کا موضوع مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں اور اُن کی ضروریات ہوتا تھا اپنے اخبار میں درج کرتے رہے۔

انسانی اعمال و عقائد میں اُس وقت بیّن فرق پیدا ہو جاتا ہے جب اپنے
اصولوں کی خود ہی پوری متابعت اسے بغاوت جیسے خطرات کی طرف لے جائے
گو نیک آدمیوں کی ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ یہ فرق کسی نہ کسی طرح مٹ
جائے اور ان کے عقیدے اور عمل کے درمیان کوئی تفاوت نہ کرے بجز متعصب
وہابیوں کے ان اشخاص کے نزدیک ضرورت جہاد اس وقت بھی ایک ناخوشگوار
فرض ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن سے سرحدی کیمپ کو مالی امداد پہنچتی
ہے۔ ان لوگوں کو امن اور وفاداری کی طرف بالخصوص دعوت دینی چاہیے، لہذا
میں چاہتا ہوں کہ سنی فتووں کی تحقیق اس نظر سے کروں کہ ان کا اثر ایسے پُرجوش
مُسلمانوں پر ہوا جو مذہبی فرائض کی ادائیگی کو زندگی کا اصل الاصول مانتے ہیں۔
اور جن کا دل کسی قسم کے خطرے یا آرام و آسائش سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس
حقیقت سے آنکھیں بند کر لینے میں کوئی فائدہ نہیں کہ ہماری مسلمان رعایا کی بہت
بڑی تعداد مذکورہ بالا جماعت سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک تہائی صدی تک
انہوں نے ایک باغی فوج کو اوّل راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف اور اُس
کے بعد اُس کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ہمارے خلاف ہر وقت لڑائی کے
لئے تیار رکھا۔ بنگال جیسے دور دراز صوبے نے اپنے خرچ پر سرحدی کیمپ کے
لئے رنگروٹوں کے گروہ تیار کئے۔ اس کے ہر گاؤں بلکہ ہر خاندان نے
اُن کی مثال کی پیروی کی اور مصارف جنگ میں حصّہ لیا۔ ان بدنصیب

بھکائے ہوئے غداروں کے گروہ کے گروہ ہم نے قید خانے میں ڈال دیئے اور عدالتوں نے یکے بعد دیگرے ان کے سرغنوں کو سمندر پار کے بے آب و گیاہ جزیروں میں بھیج دیا۔ لیکن اس کے باوجود سارے ملک نے ہماری سرحد پر اسلام کی بیکسانہ امیدوں کی آب یاری روپیہ اور آدمیوں سے کی بلکہ اب تک عیسائی حکومت کے خلاف خونی احتجاج پر مُصر ہے۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کلکتہ کی سوسائٹی نے جو فتوے شائع کیا ہے اس کا اثر اس کثیر التعداد اور خطرناک جماعت پر مطلق نہیں پڑا۔ بہرحال اس رسالہ نے جہاد کے خلاف دلائل کے دو مختلف اور نمایاں راستے واضح کئے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو اس سوسائٹی کی اپنی رائے ہے اور دوسرے علمائے شمالی ہند کا باقاعدہ فتوے لے مگر اس دوسری رائے کو محض اس لئے درج کیا گیا ہے کہ اس کی تردید کی جا سکے۔ مگر اس کی اشاعت جداگانہ طور پر اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے اور جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا وہ بغاوت کے خلاف ایسے مستند دلائل پر مشتمل ہے جو اسلامی کتابوں کے حوالے سے قائم کی گئیں۔

اس رسالے کے فاضل مصنفین کو اوّل یہ بتلانا چاہیئے تھا کہ اُن کے دلائل کن مواقع پر ناکام رہتے ہیں۔ رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کیا جائے تاکہ اسلامی رعایا کے لئے جہاد کا خیال ناجائز ٹھہرے۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صفحہ اوّل کی اس عبارت میں جس کی حیثیت بنیادی ہے

اس لئے" کا لفظ موجود نہیں اور اس سے بھی زیادہ غور طلب یہ ہے کہ علمائے مکہ اور مولوی عبدالحی کا فتوٰے صرف اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے مگر بہ کمال ہوشیاری اس نتیجہ سے کہ لہٰذا یہاں بغاوت ناجائز ہے گریز کرتا ہے۔ حقیقت میں اسلامی شریعت کے مطابق ٹھیک فیصلہ اس کے برعکس ہوگا۔ علمائے مکہ نے بھی جب یہ فتوٰی دیا تھا تو وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے ان کا زور اس امر پر ہے کہ ہندوستان فی الواقعہ دارالاسلام ہے اور یہ فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا ہے کہ بنا بریں انہیں جنگ یا دوسرے ذرائع سے اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان کافروں کو جو اس ملک کی حکومت پر متصرف ہو گئے ہیں اور کئی ایک طریقوں سے پچھلے مسلمان بادشاہوں کی قانونی اور مذہبی سرگرمیوں میں دخل انداز ہو رہے ہیں[1] یہاں سے نکال دیا جائے۔

اس رسالہ کا انداز بحث یہ ہے۔ ہندوستان اب بھی دارالاسلام ہے کیونکہ یہاں پہلے اسلامی حکومت قائم تھی جسے گو اب ایک کافر قوم نے فتح کر لیا ہے۔ مگر وہ تین شرائط جو کسی ملک کے دارالحرب بننے کے لئے ضروری ہیں اُس پر عائد نہیں ہوتیں۔ ان تین شرائط کو اصل میں اسلامی شریعت کے مستند ترین فقیہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے بیان کیا تھا مگر وہ اس رسالے میں نقل ہوئیں تو پرانی اور مسلمہ کتابوں سے نہیں بلکہ فتاوئے عالمگیری سے جو اورنگ زیب عالمگیر کے

---

[1] علمائے مکہ کا فتوٰے ضمیمہ نمبر ا

زمانے کی یادگار ہے پھر اس کتاب کا حوالوں اور قدیم تصانیف کے مفہوم میں فرق ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو شرائط امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے بیان کیں یا زمانہ سلف کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں وہ بجنسہٖ ہندوستان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ گویا قدیم اصولوں کے مطابق ہندوستان واقعی دارالحرب ہے۔ میں قانون کی ان دونوں تشریحات کو آپ کے سامنے درج کر دیتا ہوں اور اُس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔

وہ تین شرائط جن کی بنا پر کوئی ملک دارالحرب بن جاتا ہے :۔

رسالہ کی عبارت صفحہ ۳ بحوالہ فتاویٰ عالمگیری	سراج العمادیہ اور دیگر کتب جو فتاویٰ عالمگیری سے پہلے کی ہیں
(۱) جب کفار کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے اور اسلامی قوانین کی پابندی نہ ہو	(۱) جب کفار کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے۔
(۲) ایسا ملک جو دارالحرب کے ساتھ ساتھ اس طرح پیدا ہو جائے کہ اس ملک اور دارالحرب کے درمیان دارالاسلام کا کوئی شہر نہ ہو	(۲) ایسا ملک جو دارالحرب کے ساتھ اس طرح چلا جائے کہ اُس ملک اور دارالحرب کے درمیان کسی دارالاسلام سے اسے کوئی امداد پہنچائی جا سکے۔
(۳) جب ہر مسلمان کی مذہبی آزادی	(۳) جب مسلمانوں اور ذمیوں کو امان

سلب کر لی گئی ہو نہ ذمی (وہ کافر جس نے ہمیشہ ہمیشہ اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے کی جملہ شرائط تسلیم کر لی ہوں) کو وہ مراعات حاصل ہوں جو اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھیں

اول حاصل نہ ہوا یہ ایک اصطلاح ہے جس کو آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔[1]

یہ تین شرائط جو پرانی اور مستند کتابوں میں مرقوم ہیں ہندوستان پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ پہلی شرط کے مطابق آپ نے دیکھا ہوگا کہ فتوے عالمگیری میں چند الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں جن کو راقم الحروف نے باریک خط میں لکھ دیا ہے اور جن کی قدیم کتب شرعی یا براہ راست امام ابوحنیفہ سے کوئی سند نہیں ملتی[2] پہلی

---

[1] ان حوالوں اور دوسرے فتووں کو جمع کرنے اور بعض دوسرے دلائل کے لئے جو اس سنی رسالہ کی شرح میں مندرج ہیں میں کلکتہ محمڈن کالج کے پروفیسر مسٹر بلوک کا ممنون احسان ہوں۔ وقت آئے گا جب اہل یورپ ان کو ہندوستانی علوم کا بہترین عالم تصور کر لیں گے [2] امام ابوحنیفہ کے نزدیک اوپر کی تین شرائط پوری ہو جائیں تو دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے۔ ان کے دو شاگرد "شیخین" یعنی امام محمد اور امام یوسف کا قول ہے کہ صرف ایک ہی شرط کا پورا ہونا کافی ہے۔ کلکتہ کے سنی مسلمان امام ابوحنیفہ کے قول کو شیخین کے قول پر ترجیح دینے میں حق بجانب ہیں (رسالہ کا صفحہ نمبر ۲) مگر میں یہ ثابت کروں گا کہ ہندوستان میں تینوں شرطیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے مطابق ہندوستان دارالحرب ہے۔

مستند شرط صرف یہ ہے کہ جب کافروں کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے جو بلا شک و
شبہ اس وقت ہندوستان پر عاید ہو جاتی ہے۔ دوسری شرط کو نقل کرتے ہوئے
اس رسالے نے پہلی شرط میں ایک غیر ذمہ دارانہ اضافے کی طرح بغیر کسی سند کے
کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ کتب سلف کے مطابق ہندوستان دار الحرب ہے کیونکہ
اس کے اور انگلستان (دار الحرب زیر بحث) کے درمیان کوئی ایسا ملک نہیں
جو ہندوستان کو دار الحرب بننے سے بچائے اور اس کی امداد کر سکے جب انگلستان
نے ہندوستان کو فتح کیا تو ان دونوں ممالک کے درمیان صرف سمندر کا راستہ تھا
لیکن حموی اور طحطاوی میں صاف صاف مرقوم ہے کہ سمندر دار الحرب ہے گویا
اس وقت بھی جب یہ ملک فتح ہوا اور آج بھی ہندوستان اور انگلستان
کی درمیانی شاہراہ پر کوئی ایسا اسلامی ملک واقع نہیں جو اس کی امداد کر سکے۔
کابل دار الاسلام اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے مگر اس کا اس مسئلے سے کوئی
تعلق نہیں کیونکہ امام ابو حنیفہ کی شرط کے مطابق اس ملک کا دونوں ملکوں کی
شاہراہ پر واقع ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس ملک کی دار الحرب نہ بننے میں مدد
کر سکے۔ ظاہر ہے کابل کے متعلق کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان
اور انگلستان کے درمیان واقع ہے یا اس میں اتنی قوت ہے کہ ہندوستان
کی مسلمان آبادی کی مدد کر سکے۔

مگر سب سے زیادہ خطرناک غلط بیانی جو اس رسالہ میں کی گئی ہے اس کا

تعلق تیسری شرط کے بیان سے ہے۔ اس شرط کا سارا دارومدار "امان اول" کے معنوں پر ہے جس کا ترجمہ اس رسالہ میں مذہبی آزادی کیا گیا ہے۔ مگر یہ الفاظ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ امان کے لغوی معنے ہیں سلامتی اور حفاظت اور امان اول کے معنی جامع الرموز میں صاف صاف بیان کئے گئے ہیں کہ ہر قسم کی سلامتی اور مکمل مذہبی آزادی جو مسلمانوں کو اپنی گذشتہ اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھی۔ کلکتہ کے سُنی مسلمان بھی اس سند کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ایک ملک دارالحرب بنتا ہے تو اُس وقت جب (۱) مسلمانوں اور ذمیوں کو صرف اس قدر امان (مذہبی آزادی) دی جائے کہ اس کا انحصار صرف کافروں کی مرضی پر (۲) مسلمانوں کی وہ مذہبی حیثیت جو انہوں نے حاکم قوم ہونے کی حیثیت سے اپنی کافر رعایا کو دے رکھی تھی برقرار نہ رہے بحالت موجودہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں شرطیں اس وقت ہندوستان پر عائد ہوجاتی ہیں۔ امان یا مذہبی آزادی جو اس وقت مسلمانوں کو حاصل ہے وہ تمام کی تمام اُن کے عیسائی حاکموں کی مرضی پر منحصر ہے اور وہ اُس کو اُسی حد تک حاصل کر سکتے ہیں جس حد تک ہم اس کی اجازت دیں۔ لہذا یہ حالت امان مکمل یا ان مذہبی مراعات سے کئی درجہ کم ہے جو ان کو پہلے حاصل تھیں۔ انگریزی حکومت مسلمانوں پر ٹیکس لگاتی ہے اور اُس کو عیسائی گرجوں کی تعمیر اور پادریوں کے لئے ضروریات زندگی بہم پہنچانے میں صرف کرتی ہے اُس نے مسلمانوں کی بجائے جو اُس کی آمد

کے وقت اضلاع اور صوبجات کے حاکم تھے انگریز حاکم مقرر کئے اُس نے ایک باقاعدہ اعلان کے ذریعے مسلمان قاضیوں اور قانونی افسروں کو برطرف کر دیا[1]۔ اُس نے عدالتوں میں انگریزی زبان رائج کی اور اسلامی دستور العمل اور قوانین کو برطرف کر دیا۔ اُس نے بدنصیب اور بیمار عورتوں کو ایکٹ[2] (XIV) مجریہ ۱۸۶۸ء کے ماتحت تکلیف اور مصیبت سے بچا لیا۔ اُس نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جیسا کہ اسلامی شرح کی رو سے ایک بادشاہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ تمام مسلمان فریضہ نماز کی ادائیگی کے لئے مساجد میں جاتے ہیں ہماری عدالتوں میں دعویٰ پر ٹکٹ لگانا ہمارے قوانین میعاد، ہمارے ججوں کے یہ فیصلے کہ غیر ادا شدہ رقم پر سود ادا کیا جائے۔ ہمارا سارا قانونی دستور العمل ہماری مذہبی رواداری سب کی سب قوانین کے خلاف ہیں اور اُس امان یا مکمل مذہبی رواداری اور شہری آزادی میں خلل انداز ہوتی ہیں جو ہماری رعایا کو اسلامی حاکموں کے ماتحت حاصل تھی۔ پھر اہل الذمہ یعنی مسلمانوں کی کافر رعایا کی مذہبی حیثیت میں بھی کافی تبدیلی ہو گئی ہے۔ عیسائی ذمی اب رعایا نہیں رہے بلکہ فاتح اور حاکم ہیں ہندو ذمی اب جزیہ ادا نہیں کرتے اور سینکڑوں طریقے ہیں جن کے ماتحت ہم اُن کے مذہب میں دخل انداز ہوئے ہیں مثلاً کاؤکشی، گناہوں کی پاداش میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے رواج کی منسوخی، ستی کی موقوفی، ذات پات کے

---

[1] قاضی ایکٹ نمبر ا ۱۸۶۴ء کی رو سے [2] ہندوستان کی متعدی بیماریوں کا ایکٹ۔

رواج سے بے پروائی اور جو عیسائی ہو جائے اُس کی قانونی حفاظت۔ مختصراً یہ کہ مسلمانوں اور ذمیوں کی امان اوّل یعنی پہلی حیثیت کو ہم نے بالکل بدل ڈالا ہے امام ابو حنیفہ کی تیسری شرط کے ماتحت بھی ہندوستان کا ملک اب دار الحرب ہے۔

پھر اس مسئلے کا جیسا کہ بعض ملتے جلتے واقعات سے واضح ہو جائے گا کئی بار فیصلہ ہو چکا ہے۔ یونان اُس وقت تک دار الاسلام تھا جب تک ترکوں کے ماتحت رہا۔ پچاس سال کا عرصہ ہوا اُس نے اسلامی جُوا اپنے کاندھے سے اُتار پھینکا لہٰذا اس زمانے سے یہ ملک دار الحرب تصوّر کیا جاتا ہے حالانکہ اُس میں بہت سے مسلمان آباد ہیں۔ یہی کیفیت ڈینیوب کے دوسرے صوبجات کی ہے اور یہی صورت حالات جنوبی سپین اور ہر اُس ملک پر چسپاں ہوتی ہے جس میں کوئی ایسا انقلاب حکومت ہو چکا ہے۔ امام محمدؒ نے جو امام ابو حنیفہ کے مشہور و معروف شاگرد ہیں اپنی کتاب مبسوط میں اس اصول کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ ”جب ایک اسلامی ملک کافروں کے قبضے میں آجائے تو وہ ملک اُس وقت تک دار الاسلام رہتا ہے جب تک کفار مسلمان حاکموں اور قاضیوں کو برقرار رکھیں اور اپنا کوئی نیا قانون جاری نہ کریں۔“ ہم نے مسلمان حاکموں کو برقرار نہیں رکھا اور قاضیوں کو برطرف کر دیا ہے گو عارضی طور پر ہی مزید براں ہم نے اپنے قوانین نافذ کیے لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کے

عقیدے کو دیکھا جائے تو ہندوستان کو اب دارالاسلام کہنا غلط ہوگا۔

وہابی اپنی رائے کی ابتدا اس اعلان سے کرتے ہیں کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے لہٰذا اس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہوگیا ہے۔ کلکتے کا رسالہ شق اول سے انکار کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ ابھی تک دارالاسلام ہے۔ لیکن وہ اس مسئلے کے ثابت کرنے میں ناکام رہا۔ اور اس سے اُن کثیر التعداد نیک مسلمانوں پر مطلق اثر اندازنہیں ہوگا جن کو ہمیں اپنا طرفدار بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ شمالی ہندوستان کے علما نے اس مسئلہ پر دوسرے نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ وہ وہابیوں کی شق اول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان اب دارالاسلام نہیں رہا، مگر اس بات سے انکار کہ اندریں حالات جہاد فرض ہوگیا ہے۔

میرے خیال میں اس مصیبت کا صحیح ترین حل یہی ہے کہ اگر ہندوستان کو دارالاسلام تصور کیا جائے جیسا کہ مکہ معظمہ کے علما نے نہایت عیاری سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے تو دیندار مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہمارے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔ اگر ہندوستان اب بھی مجازی طور پر دارالاسلام ہے تو ہماری مسلمان رعایا کا زائد حصہ ہمارے خلاف بغاوت کرنا لازم ٹھہرائے گا۔ تاکہ اسے حقیقی طور پر دارالاسلام بنایا جائے۔ اسلامی قانون کی ہر کتاب میں مرقوم ہے کہ اگر کافر دارالاسلام کے کسی شہر پر حملہ کردیں یا اُس پر قابض ہوجائیں تو ہر

مسلمان مرد عورت بچے پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ کرے اور وہاں سے نکال دے۔ یہ اصول بالکل طے شدہ ہے کیونکہ جب روسی اسلامی ترکستان میں داخل ہوئے تو امیر بخارا کو اُس کی رعیت نے مجبور کر دیا تھا کہ ان کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ اگر ہندوستان واقعی دارالاسلام ہے تو ضرور ہے کہ آئے دن بغاوت کی کوئی نہ کوئی وجہ پیدا ہوتی رہے۔ ہماری مذہبی رواداری ہمارا سب سے بڑا جرم ہے۔ مثال کے طور پر (زیادہ سنگین جرموں کو چھوڑ کر) اسلامی کتابوں کی تعلیم ہے کہ اگر اسلامی مُلک کا بادشاہ مذہب کے بقا اور اُس کی اشاعت میں دلچسپی نہ لے تو اُس کے خلاف بھی جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ جب اکبر نے اپنے زمانہ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ رواداری برتی اور اس کے ماتحت اسلامی قوانین میں ترمیم کر دی تو بغاوت کے جواز میں باقاعدہ فتوے شائع کیا گیا اور ایک خونریز جنگ مترتب ہوئی۔ موجودہ حالت میں بغاوت اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔ کیونکہ اگر ہندوستان ابھی تک دارالاسلام ہے تو انگریزوں نے طرح طرح سے اسلامی قوانین میں دخل اندازی کی ہے۔ انہوں نے قاضیوں کو برطرف اور اسلامی دستور العمل کو منسوخ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے مکہ معظمہ کے فتوے کو جو تعصب اور نارواداری کا مرکز ہے بڑے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اور کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کی طرح یہ نتیجہ قائم کرنے کے برعکس کہ اس سے یہاں بغاوت ناجائز ہے انہوں نے اس بات کو

اپنے ہندوستانی ہم مذہبوں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ خود ہی اس کے مخالف نتیجہ اخذ کرلیں اور وہ یہ کہ اندریں حالات ان کے لئے بغاوت کرنا فرض ہے۔

بہر حال ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو یہ نتیجہ اخذ کرنے سے گریز کرے گی۔ وہ مطمئن ہے کہ کلکتے کی محمڈن لٹریری سوسائٹی، یسی معتبر انجمن نے مشہور علما[1] کے ذریعہ اس امر کا باقاعدہ اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان اب بھی دارالاسلام ہے اور اس لئے یہاں بغاوت پھیلانا فضول اور بے معنی ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح اصولی جھگڑے بے شمار ہیں اس لئے قارئین کو اس جماعت کے ٹھیک ٹھیک جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے ذیل میں اُس ذی عزت شیخ کی تقریر نقل کرتا ہوں جو اُنھوں نے اُس جلسہ میں ارشاد فرمائی۔ جس کی روداد کے طور پر یہ رسالہ قلمبند ہوا[2]

لہ مولوی کرامت علی جونپوری۔ شیخ احمد آفندی انصاری۔ مولوی عبدالحکیم اور ان کے علاوہ معززین اسلام میں سے ایک جس نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی ہے اور عملی ذہانت کا مالک ہے۔ یعنی خان بہادر مولوی عبداللطیف۔

لہ شیخ احمد آفندی انصاری نے مدینہ منورہ کے ایک معزز شہری اور حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد جن کا شمار صحابہ رسول اللہ صلعم سے ہوتا ہے (جو کچھ مدت سے اس شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے) اُٹھ کر فرمایا: میں اس سوسائٹی کا رکن نہیں لیکن چونکہ خوش قسمتی سے اس جلسہ میں موجود ہوں اس لئے اظہارِ خیال کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ زیر بحث (بقیہ صفحہ ۱۹۷)

انگریز چونکہ ہندوستانی معاملات کو مغربی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور غلط سمجھتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اُن کی ایشیائی رعایا بھی جو برطانی جزائر کی آبادی

(بقیہ صفحہ ۱۹۶) مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس سے مسلمانوں کے بہت سے دینی اور دنیاوی اعمال کا جائز و ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ جس کا اثر اُن کے شخصی اعمال پر بھی پڑے گا۔ کیونکہ وہ اس ملک میں آئے اور کئی سال سے یہاں قیام پذیر ہیں۔

جناب صدر نے کہا ہمیں ان کے خیالات کو سُن کر بے حد خوشی ہوگی اور ہم اس کے لئے ان کا شکر ادا کریں گے جو کچھ بھی وہ کہیں ہمارے نزدیک اس کی بڑی وقعت ہوگی

شیخ محترم نے فرمایا کہ انہوں نے اکثر ممالک کی سیر کی ہے اور وہ دو مرتبہ قسطنطینیہ بھی جا چکے ہیں۔ اول سلطان محمود خاں مرحوم کے زمانے میں اور پھر موجودہ شہنشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے وقت۔ اس دفعہ انہوں نے وہاں صرف چودہ مہینے قیام کیا انہوں نے مصر شام اور ایشیائی ترکی کے دوسرے شہروں کی سیر بھی کی اور وہاں مختلف مقامات میں قیام بھی کیا ہندوستان میں اب وہ چوتھی بار آئے ہیں۔ پہلے پہل اُنتیس سال ہوئے وہ اس ملک میں آئے تھے اور اس وقت انہوں نے مختلف شہروں میں تقریباً ساڑھے سات برس گزارے۔ اڑھائی سال دہلی۔ دو سال اور نو مہینے لکھنؤ میں جب محمد علی شاہ مرحوم یہاں حکومت کر رہے تھے۔ وہ جب تک وہاں رہے شاہی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ شاہ مرحوم اُن سے بڑی تعظیم وتکریم اور مہربانی سے پیش آتے۔ دو سال تک ان کا قیام حیدرآباد دکن میں رہا۔ یہاں سے وہ بڑودہ اور وہاں سے (باقی بر صفحہ ۱۹۸)

سے چھ گنا زیادہ ہے ہندوستانی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے یورپین سیاست کو اسی جہالت اور سختی کے ساتھ مروڑ سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ کلکتے کا فتویٰ اپنی غلطی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۷) افغانستان گئے ۔ چار ساڑھے چار برس وہ اس ملک کی سیاحت کرتے رہے ۔ افغانستان میں ان کا جانا امیر دوست محمد خاں والی کابل کے بھائی کے ساتھ ہوا ۔ وہ جب تک کابل میں رہے بادشاہ کے مہمان رہے ۔ دو اور موقعوں پر بھی وہ ہندوستان آئے مگر صرف حیدر آباد دکن اور سندھ میں ٹھہرتے ہوئے واپس چلے گئے اور اب ایک سال کا عرصہ ہوا وہ پھر ہندوستان آئے ہیں ۔ انہوں نے بمبئی، بھوپال، رامپور، الہ آباد پٹنہ گیا وغیرہ کا سفر کیا اور کلکتہ میں تشریف فرما ہوئے ۔ اس دفعہ بھی ان کی ہر جگہ بڑی آؤبھگت کی گئی ۔ ان کے ساتھ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال ۔ ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور جس مہربانی اور مہمان نوازی سے پیش آئے ۔ اس کا شکریہ وہ کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتے ۔ اس طویل داستان سیاحت کے بیان کرنے سے ان کا منشا یہ تھا کہ خوش قسمتی سے جو تجربہ ان کو مختلف ممالک کی سیر سے ہوا خصوصاً ہندوستان میں چار مرتبہ آنے سے اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق جو اس جلسہ میں پیش ہے جو کچھ بھی ان سے پہلے آنے والے مقررین نے کہا بالکل ٹھیک کہا ۔ بالخصوص سکرٹری صاحب کا وہ بیان جو انہوں نے ہز میجسٹی ملکہ انگلستان اور ہز میجسٹی سلطان ترکی کی دوستی کے متعلق دیا بالکل ٹھیک ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر دوستی سلطان ترکی اور انگریزی قوم کے درمیان ہے ویسی سلطان ترکی اور دنیا کی کسی قوم کے درمیان نہیں پائی جاتی ۔ انہیں یعنی مقرر کو حال ہی کا ایک واقعہ یاد آیا جس سے سلطان اور انگریزی قوم کی محبت کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے (باقی آگے)

کے باوجود بہت سے خوشحال اور آرام طلب مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگا۔ البتہ علمائے شمالی ہند کے مستند فتوے کی اشاعت بہت زیادہ ہوگی کیونکہ اس میں

(بقیہ صفحہ ۱۹۸) ہوجاتی ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے خدیو مصر نے سلطان سے نافرمانبرداری اور بے وفائی کے جذبات کا اظہار کیا جس سے بعض خطرناک واقعات کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ آخرالامر سلطان نے ایک سخت اور قطعی فرمان خدیو کے نام جاری کیا اور حکم دیا کہ اگر اس نے طرز عمل کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے تو صرف اس کی متابعت سے لیکن خدیو نے سلطان کے احکام کے بارے میں لیت و لعل سے کام لیا اور یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اس کے احکام کی متابعت سے قطعاً انکار کر دیتا مگر ایسا کرنے سے پہلے اس نے انگریزی قونصل جنرل کو تمام حالات سے مطلع کر دیا اور اس کی رائے کا انتظار کرنے لگا جو اسے بہت ہی جلد معلوم ہوگئی۔ قونصل جنرل کا جواب خدیو کو یہ تھا کہ اسے وزیر انگلستان سے ہدایات پہنچ گئی ہیں کہ اگر اس نے سلطانی احکام کو پورا نہ کیا تو وہ ایتھنز کے بحری بیڑے کو تار دے گا کہ وہ فوراً اسکندریہ پہنچ جائے۔ خدیو نے یہ سنتے ہی اطاعت قبول کی اور اپنے دل سے بغاوت کا خیال نکال دیا۔ اس نے سلطان کے قطعی اور ذلت آمیز فرمان کی شرط کو پورا کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کی بلکہ اس کے اطاعت گزاروں میں داخل ہوگیا۔ اس سے سلطان اور انگریزی قوم کی گہری دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سلطان کے بیرونی دشمنوں سے بھی جنگ کر چکے ہیں اور سلطان کے ان اندرونی دشمنوں سے بھی جو بغاوت پر آمادہ تھا لڑنے کو تیار تھے۔ بیشک سلطان کو اپنی ذات ہی خدیو مصر کو ہوش میں لانے کے لئے کافی تھی لیکن انگریزی قوم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ اس کو خواہ مخواہ مصیبت اور پریشانی میں ڈالا جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

وہابیوں کی اس رائے سے اتفاق کیا گیا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اور اس سے منطقی طور پر وہ یہ نتیجہ اخذ کیا کرتے ہیں کہ اندریں صورت مسلمانوں کا فرض ہے

(بقیہ صفحہ ۱۹۹) یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انگریز اس وقت خدیو مصر سے بھی دوستی کا دم بھرتے تھے مگر یہ دوستی صرف اس لئے تھی کہ وہ سلطان کا نائب ہے۔ انہوں نے سلطان کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے اس کی دوستی کی کچھ پرواہ نہ کی مختصر آیہ کہ اگر انگریزی حکومت خدیو کے ساتھ لڑنے کو تیار نہ ہو جاتی تو خدیو ضرور سلطان کے ساتھ بنرد آزمائی کرنے کی جرات کرتا۔ حاضرین ان آفات کا اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس اندرونی جنگ و جدل سے پیدا ہو جاتے۔ انگریزی حکومت کی فوری کاروائی سے سلطان اور خدیو دونوں خانہ جنگی کے بڑے نتائج سے بچ گئے۔ کیا اس سے بھی زیادہ اسلام کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے جو خلیفہ اسلام کے ایسے سچے دوست کے خلاف جنگ کرے بالخصوص جب انگریزی ہندوستان کو دارالاسلام تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس جلسہ میں مقررین نے جو سندیں پیش کی ہیں ان کے علاوہ مکہ و مدینہ ایسے متبرک شہروں کے صالح علماء کا فتوے بھی شائع ہو چکا ہے جو کافی سے زیادہ ہے کیونکہ یہ قابل عزت علماء تمام ملک کا جائزہ لیتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچے کہ انگریزی ہندوستان دارالاسلام ہے۔

اس فتوے کی بنا پر عرب کا ہر باشندہ بلا روک ٹوک یہاں آسکتا اور انگریزی حکومت سے شہری اور مذہبی آزادی کا پروانہ لئے بغیر جتنا عرصہ جی چاہتا ہے رہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انتیس سال پہلے جب وہ اس ملک میں آتے تھے تو اس وقت دہلی اور لکھنؤ میں سینکڑوں علمائے حق موجود تھے جن کے ساتھ ان کے مراسم نہایت دوستانہ تھے۔ باہمہ انہوں نے کسی کو یہ (باقی برصفحہ ۲۰۱)

کہ پُر امن رعایا کی زندگی بسر کریں۔ میں نے اس فتویٰ کو جو ایک اصطلاحی شے ہے ضمیمہ میں درج کر دیا ہے۔ اب میں اس مسئلہ کے تاریخی حالات مختصراً بیان کروں گا جو یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں بھی یہی مسئلہ پیش آیا تھا جس کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پھر ہوئی۔ اس زمانے میں مرہٹہ کافروں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو برباد کر دیا تھا۔ اسلامی قوانین کے مطابق جن صوبجات پر پہلے مسلمان یا ہندو حاکم تھے اب اُن پر کفار کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا دیندار مسلمانوں کے سامنے دفعتہً یہ سوال پیدا ہو گیا کہ فاتحین کے ماتحت اُن کی حیثیت کیا ہے اور کیا اُن کے خلاف بغاوت جائز ہے یا ناجائز۔ اُس وقت اُس مسئلے کا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ چونکہ مرہٹے آمدنی کا چوتھائی حصہ لینے پر اکتفا کرتے ہیں اور اصل نظام حکومت میں کسی

(بقیہ صفحہ ۲۰۰) کہتے ہوئے نہیں سنا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ وہ سب ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے اور دارالاسلام میں رہنے کے تمام احکام کو پورا کرتے تھے۔ مقرر خود اس بات کا تجربہ کر چکا ہے کہ اُن دنوں بھی آج کی طرح جمعہ اور عیدین کی نماز ادا ہوتی تھی۔ اب بھی یہاں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی جس سے اس ملک کے دارالاسلام ہونے میں فرق آگیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے اس ذی علم شیخ کو دوران سفر میں ایسے اچھے ساتھی میسر آگئے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے طبقہ عوام الناس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا انہیں خیال بھی نہیں آیا۔

طرح بھی دخل نہیں۔ اس لئے ہندوستان دارالاسلام ہے۔ انہوں نے صوبجات کے مسلمان حاکموں کو بالکل نہیں چھیڑا۔ اور مسلمان مفتیوں اور قاضیوں کو اپنے عہدے پر بدستور بحال رکھا اگر کوئی مسلمان حاکم مر جاتا تو اس کی جگہ اس کے کسی ہم مذہب کو حاکم مقرر کرتے حقیقت یہ ہے اُس کے خاندانی وارث کی جانشینی ان مخالف پر منحصر تھی جو اس حق کی تصدیق کے لئے وہ دور و دراز کے مرہٹہ دربار میں بھیج دیتے۔ ذیل میں وہ فتویٰ منقول ہے جو اُس وقت کے سب سے بڑے عالم نے دیا تھا۔[ل]

اب یہ فرض کیجئے کہ دارالاسلام پر کافروں کا قبضہ ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے نہیں روکتے۔ مسلمانوں کے قوانین کو برقرار رکھتے اور قاضیوں کو مقرر کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے حسب خواہش ان کے قوانین کو نافذ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کفار سے التجا کرنی پڑتی ہے کہ مسلمان حاکموں کا تقرر کافروں کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان حالات میں اُس کے لئے کیا احکام ہیں۔

ل اس فتویٰ کے لئے مجھے پھر پروفیسر بلوک مین کا شکریہ ادا کرنا ہے انہوں نے اس فتویٰ کو قاضی محمد اللہ بن مولوی شیخ علی بن قاضی محمد حمید بن مولوی تقی الدین محمد صابری جو ترنوہا کے عمرکی اولاد سے ہیں حاصل کیا۔ اس کا عنوان ہے احکام الاراضی یعنی زمینداری کے احکام اور اس کا موضوع ہے دارالاسلام میں اصلی جائداد کی بحث۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی اسلامی صوبہ کافروں کے ہاتھ میں چلا جائے تب بھی دارالاسلام رہتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ کوئی دارالحرب ملا ہوا نہیں نہ اُس میں کافروں کے قوانین کا اجرا ہو۔ اس کے حاکم اور مفتی سب مسلمان ہیں۔ اور جو فیصلہ کرتے ہیں شرع اسلامی کی رو سے۔ کافر بھی اپنے معاملات کا فیصلہ شرع اسلامی کے مطابق کرتے ہیں۔ بلکہ مسلمان قاضی کافروں کو سزائیں بھی دیتے ہیں۔

لیکن اس طرح ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے میں جس قدر وجوہ دیئے گئے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی اس وقت موجود نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبجات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا۔ انہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لئے مسلمان قاضی مقرر کئے اس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کی ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہرداری نے آخر ایک قابل نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم

اس زمانے میں بھی جب ہمارا ریذیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا[1] جو حکم جاری کرتے اسی کے نام پر کرتے۔

چونکہ اب تک جو لوگ[2] ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے اُن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل کو سمجھ سکیں گے جس کا ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے باقاعدہ بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے۔ ہماری اپنی حالت بھی ایک ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے رہیں

---

[1] ۱۸۳۵ء میں سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی جو ناموں کے تغیر کے ساتھ متواتر جاری رہی بادشاہ شاہ عالم پاسبان دین محمد سایہ رحمت الٰہی نے یہ سکہ ہفت اقلیم میں جاری کرنے کے لئے ڈھالا اور دوسری طرف یہ کندہ ہوتا تھا۔ مرشد آباد میں تخت نشینی کے انیسویں سال ہمایوں میں ڈھالا گیا

[2] سوائے مارش اور مونسراٹ کی کتاب کے اور کوئی کتاب اس وقت کی نہیں ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

اس سے پہلے بیان کر آیا ہوں کہ شریعت اسلامی کی رو سے ہر مرد، عورت اور بچے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کافر حکمرانوں کی بیخ کنی کرے اور انہیں ملک سے باہر نکال دے۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت بھی نہیں کی جائے اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔ ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔ شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لیے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصے حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکے اُسی کے نام جاری ہوتے رہے[2] پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دے دی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستورالعمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج

---

[1] مبسوط امام محمد

[2] ۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپے پر جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا۔

مٹ گئیں حتیٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا۔ یعنی مجلس قوانین ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا جس کی تعمیر پوری ایک صدی (۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء) سے ہو رہی تھی اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض ہوتے گئے۔ پیشتر اس کے کہ ہندوستان دارالحرب بن سکے مسلمانوں کے ان فرائض میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہوتی گئی جن کی ادائگی دارالاسلام میں ضروری ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر آیا ہوں ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ کافر فاتح کے خلاف جہاد کریں مگر اب جب کہ صورت حالات بدل چکی ہے۔ اُن پر فرائض کا ایک نیا مجموعہ عاید ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت یکسر تبدیل ہو گئی ہے اور موجودہ نسل اس تبدیلی کی متعلق ذمہ دار نہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہندوستان کے مالک ہوتے ان کے حقوق اچانک چھین لئے گئے جن کا اب اُن کو دوبارہ حاصل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اصطلاحاً اب ان کا شمار مستامنین یعنی امان چاہنے والوں میں کرنا چاہیئے چنانچہ اس حالت میں انہوں نے اپنے انگریزی حاکموں سے کچھ نہ کچھ شہری اور مذہبی مراعات حاصل کر لی ہیں (یعنی امان) یہ سچ ہے کہ اُن کو وہ حیثیت نہیں ملی جو اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھی پھر بھی اُنہوں نے

اتنے حقوق ضرور منوا لئے ہیں جو اُن کے مال و جان اور مذہب کی حفاظت کے لئے کافی ہوں۔ اُن کی نماز اور نماز باجماعت سے تعارض نہیں کیا جاتا۔ اُن کی مذہبی عمارتوں اور مقامات کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اس شہری اور مذہبی آزادی (امان) کے بدلے وہ ہماری رعایا ہونے کا اقرار کرتے ہیں جیسا کہ اُن کے آباؤ اجداد پچاس سال سے کرتے آئے ہیں۔ وہی مستند علما جو کبھی ان کو اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ دارالاسلام کے باشندے ہیں اس لئے انہیں کافر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا چاہئے اب اس بات پر مصر ہیں کہ دارالحرب کی رعایا کی حیثیت سے اُن کو اپنے عہد و پیمان کا پاس اور کافر حکومت کے ماتحت امن و امان کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔

بعینہٖ اب جہاد کا فرض بھی معطل ہو رہا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی موجودہ نسل اپنے ہی قوانین کی رُو سے مجبور ہے کہ موجودہ حالت پر راضی ہو جائے وہ اس صورت حالات کی ذمہ وار نہیں۔ حکومت خداوندی کی بنا پر اور اس خیال سے کہ بغاوت دین اسلام کو کن کن خطرات میں مبتلا کر دے گی اُن کو جنگ حدل برپا کرنے سے روک دیا۔ لہٰذا وہ مجبور ہیں کہ اُن تعلقات کو جو فاتح اور مفتوح کے درمیان پیدا ہو چکے ہیں قائم رکھیں بحیثیت رعایا انہیں اپنے فرائض اُس وقت تک پوری طرح ادا کرنے چاہئیں جب تک کہ ہم ان کی (امان) حیثیت کو اس حد تک برقرار رکھیں کہ ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں

کوئی چیز مانع ہو۔

لیکن اگر اُن کے انگریز حکام اُن کے اس خاموش معاہدے کو توڑ ڈالیں یعنی اُن کی نماز باجماعت یا جائز شرعی رسومات یا مسجدوں کی تعمیر یا ادائے حج یا علما اور پیروں کی تعظیم وتکریم یا اسلامی شخصی قوانین میں دخل انداز ہوں تو پھر اُن پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ اگر ان حالات میں جہاد فرض ہو جائے لیکن ناقابل عمل ہو تو پھر ہر دیندار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان تمام حالات کو تحریر فرما دیا ہے جن میں ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں میں بھی یہ سب باتیں مندرج ہیں۔

آئندہ باب میں میں یہ ثابت کروں گا کہ ہم کن خطرناک حالات سے گذر رہے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مسلمان رعایا کو وہ فرائض یاد دلائے جو حکام کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے ہیں بلکہ حکام پر بھی یہ امر اچھی طرح سے واضح کر دے کہ محکوموں کی طرف سے اُن کے ذمے کیا فرائض ہیں۔ شمالی ہندوستان کے علما کا فتوے، جس کے تاریخی حالات میں گذشتہ صفحات پر بالوضاحت بیان کر چکا ہوں اُن جماعتوں پر گہرا اثر رکھتا ہے جن کی خیر خواہی کی ہم کو اشد ضرورت ہے مگر اس میں وزن پیدا ہوگا تو اُسی وقت جب ہم اُن کے حقوق اور مذہبی مراسم میں دخل انداز نہ ہوں۔ ہندوستان کے تمام وہابی اور دیندار مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس ملک کو دارالحرب قرار دیتی ہے۔ گو مسلمانوں کی

وہ اکثریت جو زیادہ ہوشمند ہے تبدیلی حالات پر آنسو بہاتی ہے لیکن اس کے باوجود ان فرائض کی انجام دہی پر آمادہ ہے جو فی زمانہ ان پر عاید ہوتے ہیں قرآن مجید کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان ایک فاتح قوم ہے نہ کہ مفتوح۔ جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر دیا گیا تھا قرآن مجید کو عرصہ سے سیاست تمدن کے لئے ناکافی سمجھا جا رہا ہے اور اس لئے مسلمان اقوام کی ضروریات کے مطابق شریعت اسلامی اور قوانین عامہ میں مزید اضافے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے لئے اگرچہ اپنی مسلمان رعایا سے پُرجوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہوگا لیکن ان سے یہ امید رکھنا بھی غیر معقول نہیں کہ جب تک ہم پابندی کے ساتھ اُن کے حقوق پورے کرتے رہیں گے وہ بھی ایمانداری کے ساتھ اُس صورت حالات میں اپنے فرائض سر انجام دیتے رہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہمارے زیر نگین کر دیا ہے۔

علماء میں سے جو لوگ زیادہ زیرک تھے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیر اب ایک حقیقت بن چکا ہے۔ وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتووں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویہ کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقہ پر جاری نہ تھا۔ چنانچہ اُن میں سے ایک فتوے میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اُس وقت دارالاسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں۔ اُن میں

سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبد العزیز صاحب اور دوسرا اُن کے بھتیجے مولوی عبد الحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں۔ جب ہم نے نظام حکومت کو بتدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اُس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ اُن کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں۔ لہذا انہوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علماء سے رجوع کیا اور اُوپر کے دونوں مشہور و معروف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے جو حرف بحرف مندرجہ ذیل ہیں :-

شاہ عبد العزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اُس ملک اور اطراف و اضلاع کے مسلمانوں کے لئے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس سے باہر نکال سکیں یا اُن کو باہر نکالنے کی کوئی امید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مالگزاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اس امن و امان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دار الحرب ہو جائے گا جوں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتوؤں میں ہندوستان کا دار الحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبد الحی صاحب جو مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں: عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے

کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے) تک سب کی سب دار الحرب ہے۔ کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دار الحرب ہے۔" یہاں ان تمام شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا جن کے ماتحت جملہ فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ کلکتہ اور اس کے ملحقات دار الحرب ہیں۔

ان فتووں سے عملی نتائج بھی مترتب ہوئے۔ وہابیوں نے جن کا جوش اُن کے علم کی نسبت بہت زیادہ ہے اس اصول سے کہ ہندوستان دار الحرب ہے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔ زیادہ روشن خیال مسلمان گو اس حقیقت پر بہت غمگین ہیں مگر اس کی وجہ بغاوت قرار نہیں دیتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان روحانی مراعات میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر دار الاسلام میں جہاں مسلمانوں کی مذہبی حیثیت تمام و کمال قائم ہوتی ہے نماز جمعہ فرض ہے لیکن ہندوستان میں صرف دیندار مسلمان ہی اس نماز کی شرکت سے گریز نہیں کرتے بلکہ چند ایک مساجد میں اس کی ممانعت بھی کر دی گئی ہے چنانچہ کلکتہ کے دو مسلمان جو اپنی طرز زندگی میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں ہمارے یعنی محمڈن کالج کے سابق ہیڈ پروفیسر[1] اور سابق قاضی القضاۃ[2] جمعہ کی نماز سے احتراز فرماتے

---

[1] مولوی محمد وجیہ صاحب [2] قاضی القضات مولوی فضل الرحمن صاحب

رہے۔ وہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہوئے اس بات کے قائل تھے کہ اس طرح ہماری روحانی مراعات میں کمی واقع ہوگئی ہے لیکن ان کی زندگی وفادار رعایا اور باوفا ملازموں کی تھی۔ بہت سے مسلمان جو ہندوستان کی بدلی ہوئی حالت کا اقرار کرتے ہیں اس حد تک نہیں بڑھتے کہ نماز جمعہ کی روحانی تسکین سے بھی احتراز کریں۔

لہٰذا عام مسلمانوں کو اگر یہ پتہ چل جائے کہ وہ اپنی روح کو اذیت پہنچائے بغیر نماز جمعہ میں شریک ہوسکتے ہیں تو یقین ہے کہ وہابیوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیں گے۔ علمائے شمالی ہند کا باقاعدہ فتوے جس کو شائع ہوئے کچھ عرصہ ہوا اور جس کے تاریخی حالات میں نے بیان کر دیئے ہیں ہزاروں مسلمانوں کی تسکین و تسلی کا باعث ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے ہماری حکومت پر یہ خاموش رضامندی انہیں بحثوں کا معمولی سا نتیجہ ہے جو مسلمان کو بے چین کر رہی ہیں۔ مگر اسلام کا متعصبانہ جذبہ اپنے پیروؤں کو اس رضامندی سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤاجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی

سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سُوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔

مسلمانوں کی یہ دو جماعتیں سیاسی طور پر کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں مجھے ہندوستان میں اس بات کو دیکھ کر بہت ہی رنج ہوتا ہے کہ اس ملک کے بہترین آدمی ابھی ہمارے طرفدار نہیں۔ وہ اب تک متواتر ہماری مخالفت کرتے چلے آئے ہیں اور یہ بات کہ انہوں نے کچھ دنوں سے اس پرانی دشمنی کو ضروری فرائض سے خارج کر دیا ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم اُن سے آج بھی زیادہ سے زیادہ جو توقع کر سکتے ہیں صرف یہ کہ ہماری مخالفت نہ کریں لیکن اگر کوئی حکومت صحیح معنوں میں حکومت ہے تو وہ اس خاموش رضامندی پر جو مذہبی فرائض کی بنا پر قائم ہو زیادہ اعتبار کر سکتی ہے بہ نسبت اُس وفاداری کے جس کی بنا ناپائدار خود غرضی پر ہو[1]

---

[1] اگر حکومت یہ مناسب خیال کرے تو اُس کو علمائے اسلام کے سامنے یہ سوال قطعی شکل میں پیش کرنا چاہیئے تاکہ وہ ایک فیصلہ کر سکیں۔ خوش قسمتی سے سردست اس قسم

کے طرز عمل کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کبھی اس کی ضرورت ہوئی تو یہی سوال عوام کی وفاداری کو آزمانے کی بہترین شکل ہوگی۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مسلمان اس صورت میں جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہے حملہ آور ہو تو کیا اُس وقت مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ انگریزوں کی امان کو خیرباد کہہ دیں اور حملہ آور کی امداد کریں۔

باب چہارم

انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں سے ناانصافیاں

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ مسلمان خود اپنے قوانین ہی کی رو سے مجبور ہیں کہ ہماری حکومت کے ماتحت پُرامن زندگی بسر کریں لیکن یہ مجبوری صرف اُس وقت تک باقی رہتی ہے۔ جب تک ہم بھی معاہدے کے اُس حصے کو پورا کرتے رہیں جس کا تعلق ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے اُن کے حقوق اور رُوحانی مراسم کا احترام ضروری ہے۔ جب کبھی ہم اُن کے شہری اور مذہبی حقوق (یعنی امان) میں دخل دیں گے جس کی بنا پر وہ اپنے مذہبی احکام کو پورا نہ کرسکیں تو اُس وقت وہ فرائض بھی جو ہمارے متعلق اُن پر عاید ہوتے ہیں ختم ہو جائیں گے۔ ہم اُن کو زبردستی اپنا مطیع بنا سکتے ہیں مگر اُن سے اطاعت

کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت کا یہ طرزِ عمل نہایت درجہ قابلِ تعریف ہے کہ اُس نے گذشتہ فاتحوں کی طرح فوجی حکومت قائم نہیں کی بلکہ ایک آئینی حکومت کی بنیاد رکھی ہے جو لوگوں کی ضروریات کے عین مطابق اور اُن کی خیر خواہی کے لئے قائم ہے۔ اگر مسلمانوں پر ناواجب سختیاں کی گئیں تو وہ اس حکومت کے قیام کو ناممکن کر دیں گی۔ اُن کے معاملہ میں تو معمولی سے معمولی شکایتیں بھی عظیم الشان سیاسی غلطیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی فاش غلطیوں کا مجموعی اثر اسلامی قوانین کی رو سے یہ ہوگا کہ حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات یکسر بدل جائیں اور وہ اُن فرائض کی بجا آوری سے جو بحیثیت رعایا اُن پر عائد ہوتے ہیں اپنے آپ کو بری الذمہ تصور کریں لہٰذا یہ امر اُن کو سازش اور بغاوت پر مجبور کرے گا۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ حکومت ہند اس قسم کی فاش غلطیوں کا ایک سے زیادہ مرتبہ ارتکاب کر چکی ہے۔ البتہ اپنی کوتاہیوں کو بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ میرے بیانات کا تعلق اُن مسلمانوں سے ہے جو انگریزی حکومت کے ماتحت پُرامن رہنے کا اقرار کر چکے ہیں۔ پچھلے ابواب میں دو حقیقتیں ثابت کی گئی تھیں۔ اوّل یہ کہ ہماری سرحد پر ایک باغی کیمپ بدستور قائم ہے اور ثانیاً یہ کہ ہماری سلطنت کی حدود کے اندر بھی ایک دیرینہ سازش کام کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت مسلح غداروں کے ساتھ کسی قسم کی گفت و شنید کرنے کے لئے تیار نہیں

جن لوگوں کا ہاتھ قبضہ شمشیر پر ہے اُن کو تلوار کے گھاٹ ہی اُتار دینا چاہیے ۔
ہر ٹوائفلس ڈروکٹ کی تمثیل جو کوہ ایلپس کی چوٹی سے متعلق ہے ہندوستانی سلطنت
پر نہایت ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتی ہے اور وہ یہ کہ امن صرف طاقت کے
سہارے قائم ہو سکتا ہے جب انگریز اس قابل نہیں رہیں گے کہ اس ملک میں
اپنی مالی حالت یا بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر حق کے لئے تلوار اٹھا سکیں تو اُن
کے لئے یہی بہتر ہوگا کہ قریب ترین بندرگاہ سے اپنے ملک کو واپس لوٹ جائیں

رہا اُن غداروں کا معاملہ جو ہماری حدود سلطنت کے اندر رہ کر مصروف
سازش ہیں تو اُن کے لئے بھی انصاف کی تمام راہیں کھلی رہنی چاہئیں ۔ پھر
انصاف بھی ایسا ہونا چاہیے جس میں رحم کا امتزاج ہو اور جو اس علم کی بدولت
نرمی اختیار کر سکے کہ یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے ہی پاک طینت
تھے اور انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنےٰ مقصد کے لئے نہیں لیا ۔ مجلس
قوانین ساز نے گرفتاری کا حق محکمۂ منتظمہ کو دے رکھا ہے اُس سے بے شک حکومت
اس قابل ہو گئی ہے کہ اس شر کا مقابلہ کر سکے ۔ وہ سرغنوں کو صرف نظر بند کر دیتی ہے
اور انہیں یہ عزت نہیں دیتی کہ مذہب کی خاطر قید و بند کی سختیاں برداشت کریں
حکومت اُن لوگوں کے ساتھ بھی جن کو عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور
کی سزا دی ہو حقارت آمیز ملاطفت کا برتاؤ کرتی ہے جس سے یہ مجرم چند سال بعد

ل‍ے (HER TEUPELS DROCKII)

ہی مسلمانوں میں دہابی مذہب کے منکرین کی حیثیت سے واپس آجاتے ہیں اگر اس سازش کو تباہ کرنے کی کوشش دھڑا دھڑ گرفتاریوں سے کی جاتی تو متعصب لوگوں کے جوش وخروش کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھتی اور تمام دیندار مسلمانوں کی ہمدردی اُن کے ساتھ ہوجاتی لہذا اس شورش پسند جماعت کو کسی قسم کی نفرت پیدا کئے بغیر نہایت نرمی لیکن پوری قوت کے ساتھ دوسروں سے الگ کر دینا چاہئے۔

جب ہم غداری کے خلاف اس قدر سختی سے کام لے رہے ہیں تو ہمیں خیال رکھنا چاہئے کہ بے اطمینانی کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ اس قسم کی تحقیقات کی ابتدا کسی بیرونی دباؤ سے پہلے ہی ایک باعزت طریق پر عمل میں لانی چاہئے جب ایک بہت بڑی سازش کی روک تھام مراعات سے کی جائے تو اُن کو شرافت اور سخاوت سے تعبیر کرنا غلطی ہوگی۔ اگر ہم نے مسلمانوں سے کسی معاملہ میں ناانصافی کی ہے تو اب اُس کی تلافی کے لئے کسی بے جا خودپسندی کو ہمارا سدِ راہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو بہت کافی طاقت حاصل ہے اور اُسے اس بات سے نہیں ڈرنا چاہئے کہ اُس کا یہ طرزِ عمل کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔ وہ چاہتی تو سب غداروں کو جیل میں بند کرسکتی تھی لیکن اُس کے پاس اُن کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کا زیادہ بہتر طریقہ موجود ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی ہمدردی کا سلسلہ ان سے منقطع کردے۔ مگر یہ جب ہی ممکن ہے

کہ ہم ان متواتر اور مسلسل ناانصافیوں کے احساس کو دور کریں جو انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔

اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کئے گئے ہوں وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے اُن پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے اُن کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اور جو اُن کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔ یہ قاضی نکاح کے لئے مذہبی اجازت دیتے تھے اور اُن کا کام زمانہ قدیم ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ عمل میں لانا تھا۔ اُن کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے اُن کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔ ہمارا بڑا جرم اُن کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق اُن کو یقین ہے کہ بآسانی ثابت کئے جا سکتے ہیں، اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں اور شاید انگریزوں

کے تصور سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بدظن رکھتی ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت اُن کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم، جذبات شجاعت سے معرا اور سرمایہ میں کمینوں کی طرح بددیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھہراتے ہیں۔

یہ الزامات کہاں تک صحیح ہیں اور ہم اُن میں کہاں تک مجبور اس امر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے لیکن اوّل قارئین سے استدعا کروں گا کہ مسلمانوں کے متعلق ہمارے رویہ کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے دلوں سے اُس غم و غصہ کو دور کر دیں جو ایک جماعت کی نروگناشتوں نے جن کا ذکر گذشتہ ابواب میں آچکا ہے پیدا کر دیا تھا۔ بغاوت اور متعصبانہ جوش غیر ملکی حکومت کے لازمی نتائج ہیں۔ جب تک انگریزوں میں یہ صلاحیت رہے گی کہ ہندوستان پر حکومت کر سکیں وہ اندرونی غداروں اور سرحدی باغیوں دونوں سے بخوبی نپٹ سکیں گے لہٰذا جہاں تک میرا تعلق ہے مسلمانوں کی شکایت کرتے ہوئے گم کردہ راہ

وہابیوں کا کوئی ذکر نہ کروں گا اور پھر چونکہ آگے چل کر بھی اُن کا تذکرہ نہیں کیا جائے گا اس لئے یہاں اُن دو انگریزوں کی رائیں نقل کرنا بہتر ہوگا جو اس امر پر کہ مسلمانوں کی بغاوت کو اُن کی شکایات سے کیا تعلق ہے بہترین رائے دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں خاموش اسحاج اور پُرجوش بے چینی میں بہت کم فرق کیا جا سکتا ہے ہم نے پُرامن مسلمانوں کی ضروریات سے غفلت برت کر اُن کی ہمدردی کو ایک ایسی جماعت سے وابستہ کر دیا ہے جس کی آتش بیانی اور باغیانہ جذبات سے وہ بصورت دیگر پرہیز کرتے تھے۔

وہابی مقدمات کے ایک ذمہ دار افسر[۱] نے پچھلے دنوں لکھا تھا "میرے خیال میں مسلمان کاشتکاروں کے دلوں پر وہابی اصولوں کا بہت زیادہ اثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اُن کی تعلیم سے بالکل غافل ہیں"۔ اس کے بعد وہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے طور طریقوں کے ماتحت چونکہ زندگی کے بہتر ہونے کی کوئی صورت نہیں اس لئے وہ اعلیٰ جماعتیں بھی جن کی تعلیم کے لئے ہم نے کچھ نہ کچھ انتظام کر رکھا ہے اُن سے متاثر ہو جاتی ہیں۔ مقدمہ انبالہ میں اس قسم کے ایک واقعہ کا انکشاف ہو چکا ہے جس سے یہ قیاس پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔ میں عثمان علی کو بذات خود جانتا ہوں اُس کا بیان تھا کہ تین سال کا عرصہ ہوا مجھے جیسور جانے کا اتفاق ہوا جہاں میری ملاقات ناظر عدالت سے ہوئی۔ اُس نے میرا حال احوال پوچھا میں

---

[۱] مسٹر جیمز اوگ نیلے (I.C.S)

نے جواب دیا کہ میں بڑا بدقسمت انسان ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ تم لکھے پڑھے آدمی ہو تم کو اس مصیبت میں پڑے رہنے کی ضرورت نہیں۔ میری بات مان اگر پسند آجائے تو تمہاری حالت سدھر جائے گی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے اس نے جواب دیا قرآن مجید کو ہاتھ میں لو اور ساتھ کے ضلع میں چلے جاؤ اور لوگوں میں اپنے دین کی تبلیغ کرو۔ پھر ان میں سے جن لوگوں کو حسب منشا دیکھو ان کو جہاد پر آمادہ کرو۔ چنانچہ میں نے اس ضلع میں تبلیغ کی اور بہت سے آدمیوں سے روپیہ بھی حاصل کیا۔ یہ ہے وہ شخص جس کے متعلق میں اپنی دانست کے مطابق یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو کچھ اپنے عقاید کے زیر اثر اور کچھ روپے کے لالچ میں آکر۔ اور اس قسم کے آدمی تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ کاشتکاروں کو اکساتے ہیں اور دورہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی تھی کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ بعض حالات کے ماتحت ایک ہنگامہ بھی اس بے جگہ ہی سے اٹھ سکتا ہے جس طرح ایک افغان۔

ایک اور انگریز جس کا بیان اس سے بھی زیادہ قابل وثوق ہے لکھتا ہے[1] "یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہٖ کتنا

---

[1] مسٹر بے لے۔ حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کا سیکرٹری جن کی ہمدردی کے مسلمان بہت ہی شکرگزار ہیں۔

ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اُن کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا حقیقت
ہیں اس طرح اُن کی ضروری سے ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں یہ
طرزِ تعلیم لازماً ان کے مفاد کے خلاف اور اُن کی مذہبی روایات کے منافی ہے۔"

تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقۂ تعلیم پر ناز ہے حکومت کے اُن
عہدوں اور ملازمتوں میں کوئی جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے پیشتر اُن کی اجارہ
داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابل نفرت
ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا جا رہے ہیں۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی
ہے وہ بھی نالاں ہیں گو اُن کا یہ احساس مذہبی ایذا رسانی کی حد تک نہیں پہنچتا
اگرچہ ان کے مذہبی خیالات کے مطابق ناپروائی کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اُن
کے تعصب کو جس کا جواز قرآن مجید سے ہر وقت ثابت کیا جا سکتا ہے یہاں تک
برانگیختہ کر دیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب
گروہ کی شکل اختیار نہ کر لے۔ دوسری طرف صرف چند تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہوں
گے جو کسی منصفانہ اور ناواجب رنگ میں مضطرب نہیں اور جو اپنی قوم میں
بہت کچھ اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں
تک (موجودہ وائسرائے سے زیادہ کسی نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ
غور نہیں کیا) ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے

نہیں کئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نانِ جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اپنے انحطاط کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا۔ کیونکہ اُن کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مترتب ہوا۔ جب تک اس ملک کی عنانِ حکومت ہمارے ہاتھ نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا۔ وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور جملہ ضروریاتِ زندگی میں ویسا ہی طرزِ بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں۔ وہ اب بھی دنیا کو نہ اپنے احساسِ ذہنیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے حقوق سے بے پرواہ ہو کر حکومت کی ملازمتوں میں اپنی گذشتہ اجارہ داری قائم نہیں رکھ سکتے۔ دولت و ثروت کا یہ پرانا چشمہ اب خشک ہو چکا ہے مسلمانوں کے لاپرواہ اور پُرجوش فاتحوں کے نظامِ حکومت میں ماتحت عملہ تو ہندو تھا۔ لیکن بڑے بڑے عہدوں کی تقسیم یوں تھی۔

سب سے اعلیٰ بارہ عہدوں میں سے جن کا منصب پانچ ہزاری سے

زیادہ تھا۔[51] ایک بھی ہندو کو نہیں ملا۔[52] اس سے نیچے کے عہدے جن کی منصب داری پانچ ہزار سے کر پانچ سو تک تھی کل ۲۵۲ افسر تھے جن میں ۲۱ ہندو تھے یہ اکبر کے زمانے کا حال ہے۔ بعد کے زمانے میں اس درجہ کی منصب داری پر کل ۶۰۹ افسر فائز ہوئے جن میں ایک سو دس ہندو تھے۔ اعلیٰ ملازمتوں کے آخری درجہ یعنی پانچسو سے دو سو کی منصب داری میں بھی کل ۱۶۳ منصب دار تھے اور ان میں ہندو صرف ۲۶۔

انگریزی حکومت کے ماتحت اگرچہ مسلمانوں کے لئے اس قسم کی اجارہ داری کی توقع رکھنا لایعنی سی بات ہے مگر نہ انہوں نے اس کی درخواست کی اور نہ اس پر کوئی اظہار شکایت۔ انہیں یہ رنج نہیں کہ حکومت کی نوازشوں سے حسب دستور سابق انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا بلکہ یہ کہ وہ اس سے بتدریج خارج کئے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات کا گلہ نہیں کرتے کہ اب زندگی کی دوڑ میں انہیں ہندوؤں کا مقابلہ درپیش ہے۔ انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مختصر الوں کہئے کہ یہ قوم وہ ہے جس کی روایات بہت شاندار ہیں مگر جس کا اس کے باوجود کوئی

---

[51] مغلوں کے ماتحت ہندو راجہ یہ بہت ہی دلچسپ مگر چھوٹا سا رسالہ ہے جس کو پروفیسر لوک یبن نے لکھا ہے اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے

[52] شاہجہان کے وقت۔ یاد رہے کہ یہ فوجی اعزاز سول افسروں کو بھی ملتے تھے۔

مستقبل نہیں۔ اگر اس قوم کی تعداد تین کروڑ ہے تو یہ محض اس قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ اُس کے حاکموں کے لئے بھی ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔

مشرقی بنگال میں کاشتکاروں کی بہت زیادہ تعداد مسلمان ہے - ان اضلاع میں جہاں دریاؤں اور دلدلوں کی کثرت ہے اچھوتوں کو کبھی ہندو ایسی معزز قوم میں شامل نہیں کیا گیا۔ آریہ قبائل نے جنوب کی طرف نہ ساحل بحر کے ساتھ ساتھ اور نہ دہانہ گنگا کے علاقہ میں اتنی تعداد میں ہجرت کی تھی کہ وہاں کی قدیم آبادی کو برہمنی روپ دے سکے یہ لوگ چنڈال ذات پات کے دائرے سے بالکل باہر رہے۔ چنڈال دور دراز کی دلدلوں میں مچھلیاں پکڑتے اور اپنے سیلاب زدہ علاقوں میں کہیں کہیں چاولوں کی فصل بھی تیار کر لیتے تھے۔ مگر اُن کی ناپاکی کا یہ عالم تھا[۵۱] کہ اعلےٰ ذات کا کوئی برہمن اپنے آپ کو بھرشٹ کئے بغیر اُن میں بود و باش اختیار نہیں کر سکتا[۵۲] اور اگر کہیں ایسا کرے تو چند نسلوں کے بعد اُن کی اولاد کا دوسرے برہمنوں سے کوئی تعلق نہ رہے گا جن کی حقیقتاً وہ اولاد ہیں۔ اور چند دلوں کی ساونت پر شمال کی طرف رہتے ہیں[۵۳] مسلمان اس

---

۵۱ یہ اردو کے سخن اُن اضلاع کی طرف ہے جو ڈھاکہ اور دکرم پور جو برہمنوں کی ٹولیاں اخیری آبادی ہے کے جنوب میں واقع ہے۔

۵۲ یہ معلومات میں نے خود فرید پور۔ بکر گنج اور سندربن کے اضلاع میں حاصل کیں

۵۳ اس وجہ سے کہ وہ چنڈالوں میں رہتے یا ان کے پروہت ہیں۔

قسم کے نسلی امتیازات نہیں رکھتے۔ وہ ان اضلاع میں داخل ہوئے تو فوجی نو آبادکاروں یا اُن مہموں کے سرکردہ افسروں کی حیثیت سے جو زمین کی بازیافت کے لیے اس طرف بھیجی گئیں۔ زمانہ قدیم کے آباد اضلاع مثلاً میسور وغیرہ کی قدیم ترین روایات بھی اس قسم کی مہمات سے شروع ہوتی ہیں جس طرح اندرون ہند میں قدیم سورماؤں نے بڑے بڑے ہیبت ناک جانوروں کو ٹھکانے لگایا وہ شیطانی اقوام کو مطیع کرتے اور بڑے بڑے جنگلوں کو کاٹتے تھے۔ بعینہٖ زمانہ قبل تاریخ کے افق پر سب سے نمایاں حیثیت اُس انسان کو حاصل ہے جس نے ان علاقوں میں جو کبھی سمندر کی دست برد کا شکار رہتے تھے ہل چلایا۔

مسلمانوں نے جنوب کی طرف اس قسم کی بہت سی بازیافتہ زمینوں میں نو آبادیاں قائم کر رکھی تھیں اور مشرقی بنگال میں بھی اوّل اوّل سمندر کو خشکی سے علیحدہ کیا تو انہوں نے۔ اگر کوئی سیاح اُس علاقہ کی سیر کرے گا تو اسے آج بھی دُور دُور کے بے آباد جنگلوں میں اُن کے تعمیر کردہ زرعی تالاب، ساجد، گذر گاہیں، حوض اور خانقاہیں نظر آئیں گی۔ مسلمان جہاں بھی گئے اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے کچھ تو بذریعہ تلوار لیکن زیادہ تر انسانی فطرت کے دو نہایت ہی اہم تقاضا کی تحریک سے۔ ہندوؤں نے دہانہ گنگا کی قدیم اقوام کو کبھی اپنی برادری میں شامل نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے جملہ انسانی مراعات کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ ان پُرجوش مبلغوں نے ہر جگہ یہ پیغام سنایا کہ ہر شخص

کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جُھک جانا چاہیے" خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں اور مٹی کے ذرّوں کی طرح ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے"۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ فتح کے بعد فتح کا نعرۂ جنگ ایک الہامی اور متبرک حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

دہانہ گنگا کے کاشتکار آج بھی مسلمان ہیں۔ اسلام جنوبی بنگال میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ وہاں ایک خاص مذہبی ادب اور خاص زبان پیدا ہو گئی ہے "پتوس" یعنی اسلامی بنگالی شمالی ہند کی اُردو سے ایسی ہی علیحدہ ہے جیسے اُردو ہرات کی فارسی سے۔ ان کاشتکاروں کے درمیان پُرانے زمیندار گھرانے آباد ہیں اور اُن میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں حقیقت میں سارا صوبہ مسلمان اُمراء سے جو کبھی طاقتور اور برسرِ اقتدار تھے بھرا پڑا ہے۔ وہ گذشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں۔ اس وقت بھی مرشد آباد میں ایک اسلامی عدالت ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پُر از خار تالابوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روی سے خونِ جگر پیتی نظر آتی ہے اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذاتِ خود جانتا ہوں۔ اُن کے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اُن کے پوتے پوتیاں بھی ہیں اور اُن کے نواسے نواسیاں بھی لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے ہی سے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔ وہ غلیظ برآمدوں

اور ساتھ کے ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اُداس زندگیاں بسر کر رہے ہیں اور دن بدن قرض کے تباہ کن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں تاآنکہ پاس ہی کا ہندو مہاجن ایک دن اُن سے جھگڑا مول لے لے گا اور چند لمحوں میں قرضخواہوں کا ایک جم غفیر عدالت کے حکم سے بیع قطعی کا حق حاصل کر کے قدیم مسلمانوں کے اس خاندان کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کرے گا۔ یہاں تک کہ صفحہ ہستی سے اُس کا نشان تک مٹ جائے۔

اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگر کے راجاؤں کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ پہلے پہل جب انگریزوں کو اُن سے واسطہ پڑا تو اُن کی سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ یہ راجہ اپنے ستونی شامیانے میں بیٹھ کر اپنی اُس ریاست کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ جو آج کل دو انگریزی اضلاع پر منقسم ہے۔ اُن کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں اور صاف و شفاف پانی میں جس کے اندر ایک بھی خودرو پودا نظر نہیں آتا تھا منعکس ہوتی تھیں۔ راجہ کی خانگی سیڑھیوں سے ہر روز ایک سنہری بجرا مستانہ وار اس جزیرہ کا رُخ کرتا ہے جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور زنگار رنگ کے پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ محل کے دروازہ پر سپاہی پہرہ بدلتے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شہزادیوں کے باغات سے بچوں کے کھل کھلانے اور خواتین

کی شیریں آوازیں سننے میں آتی ہیں۔ مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کی بے بام و در دیواروں سے استرکاری کی تمام زیبائشیں مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور اُن کی صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں۔ اب اُن میں چاولوں کی کاشت ہوتی ہے اور اُن کے رنگا رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے۔ کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصّہ نظر آجاتا ہے تو عربی وضع کی کسی کھڑکی سے اس نظارے پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

مگر ان میں سب سے زیادہ حسرت ناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی استادہ ہے جو پُرانے زمانہ کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر ہے۔ اس کی خراب و خستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے[۱]۔ وہ بدنصیب خواتین جو کبھی رانی کہلاتی تھیں اب کبھی شام کی سیر کو پردہ دار حجروں میں نہیں نکلتیں اُن کے زنان خانوں پر چھت تک باقی نہیں۔ اُن کے مکین اب اُن معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں جو تباہ شدہ اصطبل کے پاس واقع ہیں۔ ناگر خاندان

---

[۱] میں عمارت اور تالاب کا وہ نقشہ بیان کر رہا ہوں جو میں نے سنہ ۱۸۶۴ء میں دیکھا تھا میں نے سنا ہے کہ تالاب کو صاف کیا گیا ہے اور محل اور بھی خستہ ہو گیا ہے۔

کی گذشتہ عظمتوں کی یاد صرف ایک نہر سی باقی ہے جو اب بھی دلدلوں کے بیچ میں اسی راستے سے بہتی ہے جس سے کبھی محلوں کے درمیان سے گذرتی تھی اور جسے دیکھ کر قدیم الایام روما کی خاموش یادگاروں کی ایک ہلکی سی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

دریائے ٹائبر کے سوا روما کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شئے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور جو نقل مکانی کرتی رہے اُس کو ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے۔

اس خاندان کے نمائندے خستہ محل کے ایک کونے میں دبکے ہوئے اپنی عسرت زدہ زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ وہ نشہ آمیز ٹھابوں کو چُوستے اور خودرو پودوں سے اٹی ہوئی جھیل پر حسرت بھری نگاہوں سے تکتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی سیاستدان ایوان عام میں سنسنی پیدا کرنی چاہتا ہو تو اُس کے لیئے یہ کافی ہے کہ بنگال کے کسی ایسے مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کر دے۔ وہ اپنی کہانی کو اس طرح شروع کرے گا۔ ایک قابل عزت شہزادہ بہت بڑے علاقہ پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے۔ اُس کے بے شمار خدمت گار ہیں وہ مشرقی شاہانہ دربار کی تمام روایات کو برقرار رکھتا ہے اور بستر مرگ پر مسجدوں کی تعمیر اور مذہبی اوقاف کا حکم دے کر اپنی روح کو تسکین دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے موجودہ بے عقل جانشین کی تصویر کھینچے گا۔ وہ اُن جنگلوں میں جب انگریز شکاریوں کی آمد کی خبر سُنتا ہے تو اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اور اگر اُس کے خادم مجبور بھی کریں کہ اجنبیوں کی عزت افزائی کرنا

ضروری ہے تو وہ اُن سے ملاقات پر ہمیشہ ایک ہی بات دہراتا ہے اور وہ یہ کہ فلاں تاجر نے ابھی ابھی اس کے محل کو چند سو روپوں کے بدلے قرق کر لیا ہے۔

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کئے ہیں تاکہ انگریزوں کے سامنے اُن لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں کیا جائے گا۔ میں یہ بھی بتلا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے۔ پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔

میری رائے میں اگر کسی قوم کی حالت کو درست کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہوگی تو وہ جنوبی بنگال کے مسلمان نواب ہیں۔ اُن کی دولت و ثروت کے پرانے ذرائع ختم ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ہمسایہ ہندو راجاؤں کے علاقوں کو تاخت و تاراج نہیں کر سکتے نہ بے شمار سپاہیوں کو اس غرض سے بھیج سکتے ہیں کہ کاشتکاروں کو لوٹیں۔ وہ تجارت کے قافلوں پر بھی محصول عاید نہیں کر سکتے۔ نہ عدالت سے اپنے دوستوں کے ذریعے مالگذاروں سے معافی حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ مقامی طور پر شادی، پیدائش اور فصل جمع کرنے کے موقعوں یا اسی قسم کی دوسری دیہاتی تقریبات پر ٹیکس لگا سکتے ہیں۔ اُنہیں یہ حق حاصل نہیں کہ محصول آبکاری جمع کریں یا رمضان

شریعت کے تبرک بیچنے میں ممنوعات کی فروخت سے اغماض برتنے کے لئے رشوت قبول کرسکیں۔ بنگال میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ دیوانی کا محکمہ ہے جس پر مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ محکمہ پولیس بھی آمدنی کا اچھا خاصا بڑا ذریعہ ہے اور اس کے تمام افسر بھی مسلمان تھے۔ آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی عدالتیں ہیں اور یہاں بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے اور ان سب سے بڑھ کر فوج، اس کے عہدے داروں میں وہ لوگ نہیں آسکتے تھے جو اپنے فرائض کو معمولی منافع پر بجالاتے بلکہ فاتحوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اپنے کاشتکاروں کا نام فوج میں درج کراتے اور ان کی تنخواہیں شاہی خزانے سے خود اپنے لیے وصول کرتے۔ گویا آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں۔

مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اسی حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہندو ماہر اقتصادیات یا کوئی ہندو جرنیل بھی نمایاں حیثیت اختیار کرلیتا تھا۔ ان مثالوں کی موجودگی ہی اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا[1]۔ ایک نواب کے خزانے میں ہر سال تین ذرائع

---

[1] جب کبھی ایسا ہوتا تھا تو مسلمان ناراض ہوجاتے تھے، سب سے نمایاں دو مثالیں ہیں راجہ ٹوڈرمل کے وزیر مالیات اور جرنیل مان سنگھ کے جرنیل ہوتے وقت دربار میں احتجاجی وفود بھیجے گئے۔ رانا پرتاپ کے خلاف مہم میں جرنیل مان سنگھ کے ماتحت بہت سے مسلمان

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے دولت جمع ہُوا کرتی تھی۔ فوج کی افسری، مالگذاری جمع کرنے کی خدمت اور سیاسی وقانونی خدمات کی سرانجام دہی سے یہ اُس کی عظمت کے جائز ذرائع تھے لیکن اس کے علاوہ عدالتی خدمات اور سینکڑوں اور ذرائع بھی تھے جو فراہمی دولت میں کام آتے اور جن کا ذکر میں پچھلے باب کے شروع میں کر آیا ہوں۔ لہٰذا اب اُن کا اعادہ غیر ضروری ہے بایں ہمہ سرکاری زندگی کی ان تین جائز اور نمایاں اجارہ داریوں تک محدود رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ جنوبی بنگال کے مسلمان نوابوں کے پاس برطانی حکومت کے ماتحت کیا کچھ باقی رہ گیا ہے۔

سب سے پہلے جنگی خدمات کو لیجئے جن کا دروازہ اُن پر تمام وکمال بند ہے۔ اچھے گھرانے کا کوئی مسلمان فرد ہماری فوج میں داخل نہیں ہوسکتا اور اگر وہ ہو بھی جائے تو وہ اُس کے لئے دولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی[1]

(بقیہ صفحہ ۲۳۳) افسروں نے خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ہندوؤں کے اعداد وشمار بیان کر چکا ہوں جو سب سے کم متعصب بادشاہوں کے زمانے میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

[1] ۔ بہت ہی کم مسلمانوں کے پاس گورنر جنرل کی کمیشن ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ کی کمیشن کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہندوستانی صرف سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں اور شاذونادر اگر کوئی افسری تک پہنچ بھی گیا ہے تو اُس نے بھی درجہ بدرجہ ہی ترقی کی ہے اور اس قاعدے سے کوئی بھی مستثنا نہیں۔ صرف ایک مسلمان آنریری کپتان (باقی برصفحہ ۲۳۵)

ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی امراء کو جلد یا بدیر بعض شرائط کے ماتحت انگریزی فوج میں کمیشن کی حیثیت سے داخل کر لینا چاہیے[1]۔ آج کل کوئی کمیشن افسر ملکہ کی فوج میں ملازمت سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کو مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک فوجی زندگی کے اعزازات اور معقول تنخواہ کے خواہشمند ہیں اور اس بات کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کا آبائی پیشہ ہمیشہ کے لئے اُن سے چھن گیا ہے۔

مسلمان امراء کا دوسرا ذریعہ آمدنی تھا مالگزاری کا جمع کرنا۔ اس اجارہ داری کی بنیاد اسلامی قوانین پر قائم کی گئی تھی۔ ٹیکس کی ادائیگی مغلوبیت کی نشانی ہے فاتح صرف ٹیکس ہی وصول نہیں کرتا تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا پُر نفع کام بھی انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اس بات کے بار بار دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں فاتح اور مفتوح کے تعلقات اسلامی قوانین کے اس قدر ماتحت نہ تھے جتنے سیاسی اغراض کے۔ اس کے پُرجوش اور غیر ملکی فاتحوں کو دیوانی کی تفصیلات

(بقیہ صفحہ ۲۳۴) کے درجہ تک پہنچا ہے اور وہ کپتان حیات علی ہے جس کی سفارش کرنل روڈری نے غدر کے زمانہ میں کی تھی۔ یہ مسلمان ملکہ کی کمیشن لینے کا ہر طرح حق دار ہے کیونکہ میں ذاتی طور پر اُس سے اور اُس کے کارناموں سے واقف ہوں۔

[1] اس خیال کی تائید کرنے والوں میں بنگال کیولری کے کیپٹن اوسبورن کو پیش کرتا ہوں جنہوں نے حال ہی میں ایک بہت اچھا مضمون کلکتہ ریویو میں لکھا ہے۔

میں اُلجھنا ناپسند تھا۔ وہ کاشتکاروں سے براہِ راست معاملہ کرنے کی ذمہ داری اپنے ہندو پیادوں پر چھوڑ دیتے۔ یہ طریقہ اس قدر عام تھا کہ اکبر نے جب ایک ہندو کو وزیر مالیات کے عہدے پر فائز کیا اور اسی غدر کے ماتحت ٹوڈر مل نے مالیات کا قلمدان ہاتھ میں سنبھالا تو مسلمان شہزادوں نے احتجاج کے طور پر ایک وفد دربار شاہی میں بھیجا۔ لیکن شہنشاہ نے جواب دیا کہ تمہاری جائدادوں اور رعایا کی زمینوں کا انتظام کن کے ذمے ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ہمارے ہندو دلالوں کے" "بہت اچھا تو مجھے بھی اپنی ریاست کے انتظام پر ایک ہندو کو مقرر کرنے کی اجازت دیجئے"

مالیات کے بڑے بڑے عہدے تو مسلمانوں ہی کے پاس رہے لیکن کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا دستور ہندو پیادوں کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں یہ ہندو ملازمین محکمہ مالیات کے ماتحت تھے جو مالگذاری کو مسلمان افسروں تک پہنچاتے مگر اس سے پہلے منافع کی رقم سے خود اپنا حصہ وضع کر لیتے۔ محکمہ مالیات شہنشاہ اکبر کے سامنے جوابدہ تھا اور اسلامی نظام مالیات کی ایک بہت ہی اہم کڑی۔ وہ مالگذاری کے قوانین نافذ کرتا لیکن یہ نفاذ عدالتوں کے ذریعے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوتا۔ اگر مالیہ وصول نہ ہوتا تو سپاہیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی غارتگری سے دیہاتیوں کی زندگی کو اُس وقت تک اجیرن بنائے رکھیں جب تک کہ اُن سے آخری پائی تک وصول نہ ہو جائے۔ کاشتکار اور ہندو پیادے دونوں کا وطیرہ ہمیشہ

یہ ہی رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ رقم پر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس کے برعکس اعلیٰ اسلمان عہدیداروں کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ رقم سے زیادہ وصول ہو۔[۵۱]

بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے۔ پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افسر[۵۲]۔ اسی بنا پر مسلمانوں کا دعوےٰ کہ ہم کو اُسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیے جس کے انتظام کا ہم نے اُس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقعہ یہی تھا[۵۳]۔ انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدیداروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اُٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے

---

۵۱ اس عجیب کش مکش کی مثال مسٹر ویسٹ لینڈ کی جیسور پر موجودہ رپورٹ میں ملے گی اور بنگال کے ہر ضلع کی رپورٹ میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔

۵۲ مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۱۲ء کو دیکھیے نمبر ۱۴ سے لے کر نمبر ۲۰ تک۔

۵۳ دیہاتی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے برقرار رکھیں گے۔ اور ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔

پُرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اُس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔ میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا۔ اس بندوبست سے اُن مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آ گیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگذاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔

مسلمان تعلقداروں اور ان کے سپاہیوں اور شمشیر زنوں کی بجائے اب ہم نے ہر ایک ضلع میں ایک انگریز کلکٹر مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلح خاصہ دار بھی جیسا کہ اس سے پہلے عام طور پر عدالتوں کے پیادے کام کرتے تھے۔ مسلمان امراء کا یا تو مال گذاری سے کوئی تعلق نہیں رہا یا وہ محض زمیندار ہیں جن کو زمین کی آمدنی سے ایک مقررہ حصہ مل جاتا ہے۔

بہرحال ان تبدیلیوں کو دوامی بندوبست نے رائج نہیں کیا اس نے صرف اُن کی تکمیل کی تھی البتہ اُس نے مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا مگر ایک دوسرے رنگ میں۔ اس بندوبست کا عام رجحان اس طرف تھا کہ اُن ماتحت ہندو افسروں ہی کو زمین کا مالک قرار دیا جائے جو براہ راست کاشت کاروں سے مالگذاری وصول کرتے تھے۔ میں نے ۱۷۸۹ء کے بندوبست کے مسودات کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور میں بخوبی

سمجھتا ہوں کہ اُن دفعات کے باوجود جو ۱۷۹۳ء کے قانون میں دلالوں کے بارے میں درج ہیں اُس وقت کے افسران مال کی نظروں میں پچھلے نظام مالگذاری کی صرف تین ہی کڑیاں تھیں۔ یعنی مقامی حکومت، مقامی ایجنٹ یا زمیندار جو کاشتکاروں سے براہ راست مال گذاری جمع کرتے اور کاشتکار جو زمین میں ہل چلاتے اور انہی تین کڑیوں کو ہم نے نظام میں داخل کیا۔ مسلمانوں کے نظام دیوانی کی دوسری کڑیوں کو ہم نے بالکل نظر انداز کر دیا یا وہ خود بخود مفقود ہوگئیں۔ مثلاً خود مختار تعلقداروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ یہ خاندان اپنی ریاست کے کچھ حصے کی کاشت کا دوامی پٹہ دوسروں کے نام لکھ دینے کے باوجود اپنے ماتحت زمینداروں پر ایک قسم کا قانونی حق رکھتے تھے اور پھر جب کبھی موقع ہوتا اُن سے نذرانہ کے طور پر نقدی یا جنس ہتھیا لیتے۔ ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بند وبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے۔ لکھتا ہے "اس بند وبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے۔ اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اُس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔"

سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو

مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ دعوٰی ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جونہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر یک طرفہ اس قدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے۔ ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔ مالگذاری جمع کرنے والوں کے ذمے نظام حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے۔ اُن کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مال گذاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے۔ اُن کو اس لئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولتمند ہو جائیں۔ اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اُس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سُنیں یا نہ سنیں۔ اُن کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا پھر اگر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کر کے گرفتار بھی کر لیا جاتا تو اُن کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔

لے مسٹر ویسٹ لینڈ کی کتاب ضلع جیسور صفحہ ۲۰ میں اپنی کتاب (باقی بر صفحہ ۲۴۱)

بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ماتحت حکومت کی حیثیت ایسی مشین کی تھی جس سے تھوڑے سے آدمی دولتمند ہو جائیں یہ نہیں کہ بہتوں کی حفاظت ہو سکے معلوم ہوتا ہے اس پر نہ کبھی حاکموں کے دل میں رحم پیدا ہوا نہ ان کے ضمیر نے کبھی سرزنش کی کہ غریب کاشتکاروں کی بہت بڑی تعداد موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اور موسم خزاں کی بارشوں میں اپنے تن کو اچھی طرح ڈھانپے بغیر زمین میں صرف اس لئے ہل چلاتی ہے کہ ضلع کے چند گھرانے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکیں۔ جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بے چاروں کی جان میں جان آگئی۔ سب سے بڑی ناانصافی جو ہم نے مسلمان امراء سے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے ان کے حقوق معین کر دیئے۔ اس سے پہلے نہ ان کے حقوق کوئی مستقل حیثیت رکھتے اور نہ متعین تھے۔ حکومت وقت کے بہت سے تسلیم شدہ حقوق کی بیش بہا قربانی کے بعد ہم نے یکلخت زمین کو موروثی کر دیا گویا وہ اب مستقلاً اس کے مالک تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۰) ANNALS OF RURAL BENGAL کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور صرف یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک اضلاع کے ریکارڈ کو واضح طور پر ترتیب دیکر یورپین اقوام کے سامنے پیش کرنے کا انتظام نہ کیا جائیگا اس وقت تک ہندوستانی حکومت انگریزی قوم کے ساتھ تاریخی ناانصافیاں کرنے کی مجرم ٹھہرے گی مگر شاید وہ حکومت جس نے ایسی وسیع حکومت کو تہ و بالا کیا ہے جس سے کم درجہ کی حکومت کے مقابلہ میں جو لیس جیسا بہادر ناکام رہا تھا اور جس نے ہندوستان کے مظلوم باشندوں اور تباہ شدہ مذاہب کی ایک خوشحال سلطنت قائم کر دی ہے اپنی شاندار خدمات کی تحریری تاریخ سے اغماض کرے تو وہ قابل معافی ہے۔

مگر جو قوم صدیوں سے قابل نفرت لوٹ مار کی عادی ہو چکی ہو محض گورنر جنرل کے لکھ دینے سے اپنی جاگیروں کے انتظام کا پُر امن مشغلہ اختیار نہیں کر سکتی۔ دیہاتوں پر مسلمانوں کے ظلم ختم ہو گئے اور تیس سال بعد واگذاری کے قانون نے اُن کی قسمتوں پر آخری مہر لگا دی۔ ان قوانین کی مزید وضاحت آگے چل کر کی جائے گی یہاں صرف اتنا بتلا دینا کافی ہوگا کہ پٹوں کے باقاعدہ لکھے جانے سے حکومت کی آمدنی میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا جتنا کہ مسلمان اپنے شہنشاہوں کے ماتحت گمان بھی نہ کر سکتے تھے گذشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا اُن لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے سربلند کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کی سرکشی گستاخی اور کاہلی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ایسا کیوں نہ ہو آخر وہ نوابوں اور فاتحوں کی اولاد ہیں۔

مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اُس کے جواز میں بہت سی دلائل موجود ہیں گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے اُن کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کیونکہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے ازحد ضروری تھا مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر

سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی۔

اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات و واقعات پر زور دینا ناواجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائیکورٹ کے جج بنتے اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں مسلمان کلکٹر ہی مالگذاری جمع کرتے تھے مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا محکمہ جس کا صدر مقام نظام کے محل واقع مرشد آباد میں تھا اور صوبے کے تمام اضلاع میں اُس کے افسروں کا جال بچھا ہوا تھا فوجداری قوانین نافذ کرتا تھا۔ مسلمان جیلر بنگال کے تمام قیدیوں سے رشوت لیتے تھے یا اپنی مرضی سے بھوکوں مرتے تھے۔ قاضی یعنی اسلامی قوانین کے ماہر دیوانی اور خانگی عدالتیں قائم کرتے تھے یہاں تک کہ جب ہم نے تربیت یافتہ انگریز افسروں کے ذریعے انصاف کرانا چاہا تو یہی قاضی قانونی نکات پر مشورہ دینے کے لیے اُن کے ساتھ بیٹھتے اسلامی شریعت ہی ملک کا قانون تھا اور حکومت کے تمام کارپرداز اور ماتحت افسر بدستور مسلمان ہی تھے۔ وہی سرکاری زبان بول سکتے تھے اور وہی سرکاری دستاویزات پڑھ

سکتے تھے جو فارسی کے شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ کارنوالس کے مجوزہ قوانین نے
اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اُس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ
اُس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دورِ حکومت میں
حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا۔ لیکن دوسری نصف
صدی میں ہوا کا رُخ بدل گیا۔ پہلے تو اُس کی رفتار کمزور تھی لیکن جوں جوں کاردبار سلطنت
کو دیسی زبان میں نہ کر بجوس میں جو مسلمان فاتحوں کی غیر ملکی زبان بھی چلانے کی ضرورت کا
احساس بڑھتا گیا یہ رفتار بھی بتدریج تیز ہوتی گئی۔ اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں
داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے ہیں۔
یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں بھی جہاں اب بھی پرانے طریقہ کے مطابق دوستی کی
بنا پر ملازمت مل جانے کا امکان ہے بہت کم مسلمان افسر ہیں[1] جو مسلمان ابھی اس محکمہ
میں باقی ہیں وہ بہت بوڑھے ہیں۔ ان کا کوئی جانشین نہیں۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر
یا مالگذاری کے افسر کی اسامیاں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب
جیل کی ایک دو غیر مشہور اسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور
کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار
اسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں بھی سرکاری سکول کے چالاک ہندو لڑکوں

---

[1] عملہ

سے پُر کی جاتی ہیں[۱]۔

اگر غیر مشہور زنان گزیٹڈ افسروں کے جم غفیر سے لے کر اعلیٰ ہندوؤں تک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سوال شخصی آرا کی حدود سے نکل کر یقینی طور پر اعداد و شمار کی حد میں پہنچ جاتا ہے۔ دو سال کا عرصہ ہوا میں نے ایک سلسلہ مضامین میں ثابت کیا تھا کہ بنگال کے قانونی اور مالگذاری کے محکمے میں جس کی ملازمت کی بڑی خواہش کی جاتی ہے اور جس میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو رہے ہیں ان مضامین کا ترجمہ بہت جلد فارسی میں ہو گیا اور بہت سے دیسی اور اینگلو انڈین اخبارات نے اُن کو نقل کیا تھا اُن پر بحث کی[۲] حکومت بنگال نے مسلمانان کلکتہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس بیان کے ساتھ ذیل کے اعداد و شمار زیر نظر رکھئے۔ سب سے اعلیٰ عہدوں کی جو آسامیاں پچھلی نسل سے پُر کی گئی تھیں اُن میں مسلمانوں کو زیادہ شکایت کی گنجائش نہیں کیونکہ اپریل ۱۸۶۹ء میں ہر دو ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان تھا۔ اور اب ہر تین ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے۔ دوسرے درجے میں اُس وقت تناسب دو مسلمان

---

[۱] یہ تمام بیانات سارے صوبہ پر عموماً۔ لیکن بھاگلپور اور پٹنہ کے ڈویژن کو چھوڑ کر باقی تمام اضلاع پر خصوصاً راست آتے ہیں [۲] شمال مغربی صوبے کے بہترین اخبار پائنیر میں۔ اس باب میں میں نے اُن مضامین سے مدد لی ہے۔

اور نو ہندوؤں کا تھا اور اب ایک مسلمان اور دس ہندوؤں کا ہے تیسرے درجہ میں اُس وقت چار مسلمان اور باقی تائیس ہندو اور انگریز تھے اور اب تین مسلمان اور باقی چوبیس ۲۴ ہندو اور انگریز ہیں۔ جب ہم چھوٹے درجوں میں جاتے ہیں تو ۱۸۶۹ء میں تمام اقوام کے لوگوں کی کل تعداد تیس تھی جن میں چار مسلمان تھے اور اب اُنتالیس کی کل تعداد میں صرف چار ہیں۔ امیدواروں میں جن سے اسامیاں پُر کی جاتی ہیں کل دو مسلمان تھے اور اُن کی کل تعداد اٹھائیس تھی لیکن اب اُن میں ایک بھی مُسلمان نہیں۔

بہرحال غیر مشہور محکموں میں جہاں بنگال کی سیاسی جماعتیں تناسب کا بہت زیادہ خیال نہیں کرتیں مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہے ۱۸۶۹ء میں ان محکموں میں تناسب یہ تھا۔ اسسٹنٹ گورنمنٹ انجنیرز کے تین درجوں میں چودہ ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ نوآموز طبقہ میں چار ہندو دو انگریز مُسلمان ایک بھی نہیں۔ محکمہ پبلک ورکس کے سب انجنیروں اور اوورسیروں میں چوبیس ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف ایک مسلمان تھا۔ اوورسیروں میں تریسٹھ ۶۳ ہندو تھے اور دو مسلمان تھے۔ اکونٹنٹ آفس میں پچاس نام ہندوؤں کے تھے اور مسلمان کا صفر۔ اپر سبارڈینیٹ محکمہ میں بائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہیں۔

لیکن اس تسلیم شدہ حقیقت کی اور مثالیں پیش کرنا جو سول لسٹ کے ہر صفحہ سے عیاں ہیں غیر ضروری ہے میں نے اُن گزٹڈ ملازمتوں کی ایک فہرست تیار

کی ہے جن پر ہندو مسلمان اور انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں۔

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۹۱۳ء میں	انگریز	ہندو	مسلم	کل تعداد
اکومنٹٹ سول سروس جن کا تقرر انگلستان میں بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے	۲۶۰	۰	۰	۲۶۰
عدالتہائے دیوانی کے افسر (غیر منظور شدہ) اضلاع میں	۴۷	۰	۰	۴۷
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۲۶	۷	۰	۳۳
ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
انکم ٹیکس اسیسر	۱۱	۴۳	۶	۶۰
رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۱	۱۷۸	۳۷	۲۱۶
محکمہ پولیس تمام گریڈ کے افسر	۱۰۶	۳	۰	۱۰۹
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ انجینیر	۱۵۴	۱۹	۰	۱۷۳
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	۶۲	۱۲۵	۱۴	۲۰۱
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اکونٹنٹ	۲۲	۵۴	۰	۷۶
میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میڈیکل کالج جیل خیراتی ڈسپنسری حفظان صحت	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
چیچک کا ٹیکہ اور اضلاع کے میڈیکل آفیسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً جنگی، بحری افسران فون سروے	۴۱۲	۱۰	۰	۴۲۲
کل میزان	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے جو ان کے سابق فاتح اپنے دسترخوان سے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اب ایک اور سات کا ہے۔ ہندوؤں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور دو کا مسلمانوں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا تمام نظام حکومت میں اُس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تئیس رہ گیا ہے اور وہ بھی ان گزٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے۔ در اصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی اُمید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے والا کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔

کیا ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ کیا اُن کو صرف ایک ایسے غیر جانبدار ماحول کی تلاش تھی جس میں رہ کر مسلمانوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائیں؟ کیا مسلمانوں کے پاس سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے دوسرے

ذرائع بکثرت موجود ہیں اس لیے وہ سرکاری ملازمتوں سے بے اعتنائی برتتے اور ہندوؤں کے لیے اس میدان کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں؟

بے شک ہندو مسلمانوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ مگر ابھی تک انھوں نے اُن عام اور نمایاں فوقیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا جو گورنمنٹ کی ملازمتوں میں اجارہ داری کے لیے ضروری ہے اور ایسا کرنا اُن کی گذشتہ تاریخ کے بالکل خلاف بھی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکومت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انھیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔

اعلیٰ خاندان مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی پیشہ باقی رہ گیا ہے اور وہ پیشہ وکالت کا ہے طبابت کا پیشہ جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے لیکن اب یہ حال ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہز مجسٹی کے ہائیکورٹ آف جوڈیکیچر میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں انگلو انڈین اور ہندو اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہائیکورٹ کے جج کبھی اُس قوم میں سے مقرر کیے جائیں گے جو تمام عدالتی محکموں پر قابض تھی پچھلی دفعہ جب میں

نے ۱۸۶۹ء میں اعداد و شمار جمع کئے تھے تو اُن کا تناسب حسب ذیل تھا۔

سرکاری قانونی افسر کل چھ تھے جن میں چار انگریز تھے اور دو ہندو اور مسلمان ایک بھی نہیں۔ ہائیکورٹ کے ملازمین جن کا عہدہ اتنا وقیع تھا کہ اُن کا نام شائع کیا جائے کل اکیس کی تعداد میں تھے۔ اُن میں سے سات ہندو تھے مسلمان کوئی نہ تھا۔ بیرسٹروں میں سے تین ہندو تھے جن کی تعداد اب یقیناً اور زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ لیکن مسلمان ایک بھی نہیں۔

اگر ہائی کورٹ کے وکلاء کی فہرست دیکھی جائے جن کا درجہ بیرسٹروں سے ذرا کم ہے تو یہ داستان اور بھی زیادہ عبرت ناک ہو جائے گی۔ یہ اُس پیشہ کا ایک شعبہ ہے جو تمام کا تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اُس زمانہ کے کئی ایک آدمی ابھی تک بقید حیات موجود ہیں۔ ذیل کی فہرست ۱۸۴۵ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۸۶۹ء کے وکلاء میں سے ایک انگریز ایک ہندو اور دو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں ۱۸۴۵ء تک مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھی اور اُن کا تناسب تھا چھ مسلمان اور سات ہندو اور ایک انگریز۔ جتنے وکلاء ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان (ان دونوں سالوں کو شامل کرتے ہوئے) داخل فہرست کئے گئے ہیں اُن میں سے ۱۸۶۹ء کے زندہ وکلاء ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں ۱۸۵۱ء تک بھی مسلمان اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے اور حقیقت میں وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھے لیکن ۱۸۵۱ء سے یہ صورت حالات بدلنا شروع

ہوتی ہے اب نئے نئے آدمیوں نے میدان میں آنا شروع کیا۔ قابلیت کے مختلف معیار قائم ہوئے چنانچہ اب فہرست کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۹ء تک کل دو سو چالیس ہندوستانی داخل کئے گئے جن میں دو سو انتالیس ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان۔

اب ہم اس قانونی پیشہ کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۱۸۶۹ء میں ہائیکورٹ کے اٹورنی پروکٹر اور سالسٹرز میں سے ستائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ آئندہ قانون دان بننے والوں میں سے چھبیس ہندو ہیں مسلمان کوئی نہیں۔ غرضیکہ اس پیشے کے کسی شعبے کا ذکر کیا جائے نتیجہ ہر حال میں یکساں ہوگا ۱۸۶۹ء میں رجسٹرار ہائیکورٹ کے دفتر میں سترہ ملازمین کی یہ حیثیت تھی کہ اگر اُن کے نام شائع کر دیئے جائیں تو اُن میں چھ انگریز یا ایسٹ انڈین ہوں گے گیارہ ہندو اور مسلمان صفر۔ ریسیور کے دفتر سے چار نام ملے ہیں جن میں دو انگریز دو ہندو اور مسلمان کوئی نہیں کلرک آف دی کراؤن اور ٹیکس افسر کے دفتر میں انگریزوں کی تعداد چار تھی ہندوؤں کی پانچ لیکن مسلمان مفقود۔ محکمہ قانون کے کونے کونے سے اکونٹس، شرف، کورونر اور ترجمین کے دفاتر سے بیس نام بھیجے گئے۔ اُن میں آٹھ انگریز گیارہ ہندو اور صرف ایک مسلمان اس فہرست میں اپنی قوم کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن یہ بے چارہ ایک مُلّا تھا جسے ہفتہ میں صرف چھ شلنگ تنخواہ ملتی[1]

---

[1] تقریباً چھ روپے ماہانہ (مترجم)

اب طبابت کی باری آتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ پیشہ جیسا کہ ہندوستانی اطبا میں رائج ہے اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے نزدیک پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک معزز مسلمان کے ہمیشہ دو طبی مشیر ہوں گے۔ ایک تو وہ جسے انگریزی میں عام طور پر معالج کہتے ہیں اور جسے اپنے آقا کی نظر میں بڑی عزت اور وقعت حاصل ہوتی ہے اور دوسرا جراح جس کو عرف عام میں حجام کہتے ہیں وہ داڑھی مونڈنے سے لے کر عضو کاٹنے تک تمام اعمالِ جراحی بھی کرتا ہے پھر طب و جراحت کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ جس طبیب کی حالت ذرا بھی اچھی ہے وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے البتہ حجام جراح اس قسم کی حدود کا پابند نہیں۔ عملی طور پر ہر قسم کی طب اس کی حدود میں داخل ہے۔ حقیقی مسلمان اطبا بہت ہی کم ہیں اور روز بروز کم ہوتے چلے جا رہے ہیں شمالی ہندوستان کے شہروں میں گو ابھی تک اُن کا چرچا ہے مگر بنگال کے اضلاع میں وہ بالکل معدوم ہیں۔ طبابت کا پیشہ اب یا ان ہی حجاموں کے ہاتھ میں ہے یا ہندو ڈاکٹروں کے[1]

دراصل پرانے مسلمان طبیب جو اب تک شمالی ہندوستان میں موجود ہیں عالم اور گوشہ نشین ہیں اور اس پیشے میں سرگرمی سے حصہ نہیں لیتے وہ اس فن کو عربی اور فارسی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں انگریزی فن طبابت کو حقارت کی

---

[1] ہندو ڈاکٹر بھی دو قسم کے ہیں۔ کوی راج جو دیسی طریق علاج پر قائم ہیں اور دوسرے انگریزی کالجوں کے مستند ڈاکٹر۔

نظر سے دیکھتے اور اس کو حجام جراحوں کا پیشہ سمجھتے ہیں۔ بنگال میں تو یہ حال ہے کہ جہاں کہیں بھی حکومت نے طب کی تعلیم کا کوئی بہتر انتظام کیا وہاں اس فن کو سیکھنے کے لئے اعلیٰ خاندان کے مسلمان داخل ہی نہیں ہوتے۔ ادنیٰ طبقہ بلکہ رذیل زندگی بسر کرنے والے غریب اور نادار لوگوں کا ایک جم غفیر اس غرض کے لئے جمع ہو جاتا ہے کہ انہیں صرف اس قدر مفت تعلیم دی جائے جس سے اس قابل ہو جائیں کہ فوجیوں میں دوا فروشی کر سکیں مختصراً یہ کہ وہ پہلے زمانہ ہی کے حجام جراح ہیں جن کو مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جن کی حیثیت مسلمان طبیب تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ بڑے ناشکر گزار ہیں اور اگر اُن کو فوجی پابندیوں کے ماتحت نہ رکھا جائے تو وہ اپنے استادوں کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آئیں گے۔ خوش قسمتی سے مجھے بہت سے ہندو ڈاکٹروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کے علم اور اخلاق نے ان کو اُس عزت کا مستحق بنا دیا ہے جو اُن کے شریف پیشہ کے شایان شان ہے لیکن اس قسم کے کسی مسلمان ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دراصل مسلمان فن طب کے کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کے متمنی معلوم نہیں ہوتے۔ بہرحال ۱۸۶۹ء کے اعداد و شمار حسب ذیل تھے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے طبی سند حاصل کرنے والوں میں چار ڈاکٹر تھے تین ہندو اور ایک انگریز لیکن مسلمان سرے سے ندارد۔ ایم بی کی سند حاصل کرنے والوں کی کل تعداد گیارہ تھی یعنی دس ہندو اور ایک انگریز۔ ایل ایم کی سند ایک سو چار نے

حاصل کی۔ اُن میں پانچ یورپین تھے اور اٹھانوے ہندو اور صرف ایک مسلمان۔ حال ہی میں حکومت نے دو ملکی ڈاکٹروں کو جن کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے ہے رائے بہادر کے دو خطاب عطا کیے ہیں۔ سیاسی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروری تھا کہ ایک خطاب کسی ہندو کو دیا جاتا اور دوسرا کسی مسلمان کو اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان خطابات کو کس قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود سننے میں آیا ہے کہ جس مسلمان کو یہ خطاب دیا گیا ہے وہ اس خطاب اور ذاتی قابلیت کے باوجود برادران وطن کی اعلیٰ سوسایٹی میں کوئی وقعت حاصل نہیں کر سکا حقیقت میں مسلمان اس طب کو جو ہمارے سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے شرفا کا پیشہ ہی تصور نہیں کرتے۔ یہ قومی تعصب اعلےٰ خاندان کے مسلمان لڑکوں کو اس فن کے سیکھنے سے اسی طرح باز رکھتا ہے جس طرح کہ دوسرے پیشوں اور سرکاری ملازمتوں سے اعلےٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی کثیر تعداد اُن کو باز رکھتی ہے

مسلمانان بنگال کے پرائیویٹ خطوط اور اخباری مضامین سے زیادہ کوئی شے قابل رحم میری نظر سے نہیں گذری۔ کچھ مدت ہوئی کلکتہ کے ایک فارسی اخبار نے لکھا تھا[1] آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جارہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جارہی ہے خصوصاً ہندوؤں کو۔ حکومت اپنی تمام رعایا کو برابر سمجھنے پر مجبور ہے لیکن وقت ایسا آگیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں

---

[1] اخبار دوربین جولائی ۱۴ سنہ ۱۸۶۹ء

اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے دفتر میں چند اسامیاں خالی ہوئی تھیں۔ اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی[1]۔

الغرض مسلمان یہاں تک اب قعر مذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے۔ اُن کی قابل رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اعلیٰ احکام تو اُن کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

ذیل کے فقرات اُس درخواست سے لئے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانان اڑیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی۔ اُن پر تکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آجائے مگر اس صوبے کے سابق فاتحین کی حالت زار جس سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لئے التجا کی ہے بڑی ہی افسوسناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی۔

"ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے۔ اگر سچ پوچھئے

---

[1] فارسی اخبار کے اس بیان کی تصدیق کرنے کے لئے میرے پاس اس وقت سرکاری ذرائع موجود نہیں ہیں۔ بیان پر اس وقت ضرور کچھ نہ کچھ توجہ کی گئی تھی اور اب تک اس کی تردید نہیں کی گئی۔

تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جا رہا ہے اور اُن کے سربلند ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔ مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پُرسان حال نہیں۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کے حضور میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ کے ڈویژن میں ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالا ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ سرکاری ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رُخ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے مستعد ہیں۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں ۱۰ شلنگ (۷½ روپے) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز کیا جائے گا۔"

آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں پر اس طرح سرکاری ملازمتوں اور تسلیم شدہ پیشوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے؟ بنگال کے مسلمانوں میں ذہانت کی کمی نہیں اور عزت کی خلش ہر وقت اُن کو اس بات پر اُکساتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ حکومت نے تمام بنگال میں سکولوں کا جال پھیلایا ہُوا ہے اور اُس کے بہت سے اضلاع میں مسلمان آباد ہیں۔ اس کے باوجود

یہ اسکول ایسی مسلمان جماعت پیدا کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے جو یونیورسٹی کے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو یا کسی پیشہ ہی میں داخل ہو سکے۔ انہی سکولوں سے ہر سال اچھے لکھے پڑھے بلند ہمت اور ذہین ہندو نوجوانوں کی کثیر تعداد یونیورسٹی میں داخل ہوتی اور اس کے بعد زندگی میں دولت عزت کے ہر شعبہ پر قابض ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے جگایا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیّت کے شریفانہ جذبات پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور ان کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ اُن کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔ ہندو اسلامی حکومت کے ماتحت بھی اپنی قسمت پر ایسے ہی مطمئن تھے جیسے کہ اب ہماری حکومت میں۔ آج کل ترجیح صرف اُس شخص کو دی جاتی ہے جو انگریزی زبان جانتا ہو اور ہندو انگریزی خوب سیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ترجیح اُس شخص کو دی جاتی تھی جو فارسی زبان جانتا تھا لہذا ہندو اُس وقت فارسی بھی خوب سیکھ لیا کرتے تھے یہاں تک کہ ۱۵۸۵ء ہی میں انہوں نے اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ کے ہندو مصنفین کے اشعار اب بھی ملتے ہیں۔ ہندو اگرچہ کافر تھا لیکن ایک مسلمان کا اتالیق ہونے کی حیثیت سے سرکاری عہدہ دار بنتا اور پھر مسلمانوں ہی کے علوم کا درس بھی دیتا۔ اکبر کے عہد میں ہندوؤں نے اپنے روشن ضمیر بادشاہ

سے پورا پورا تعاون کیا اور بعض اعلیٰ پائے کے فارسی شاعر بھی پیدا کئے۔ البتہ عوام میں فارسی کا چرچا اُس وقت ہوا جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ فارسی کا پڑھنا نفع بخش ہے سولھویں صدی کے اخیر میں حکومت کے وزیر مالیات نے جو خود بھی ہندو تھا حکم جاری کیا کہ اب سے تمام حسابات فارسی زبان میں رکھے جائیں گے چنانچہ محکمہ مالیات کے تمام ہندو ملازموں نے فارسی زبان سیکھ لی۔ بعینہٖ جب ہم نے سرکاری دفاتر میں انگریزی زبان رائج کی تو ابن الوقت ہندوؤں نے فوراً اس زبان کو اس حد تک سیکھ لیا جہاں تک زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اس کا سیکھنا ضروری تھا۔ ہم سے پہلے مسلمانوں کی حکومت میں جو زبان سرکاری طور پر رائج تھی اور اب ہماری حکومت میں جو زبان سرکاری ہے ان کے لئے دونوں کی حیثیت اجنبی ہے اور وہ ان سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ مگر یہ کہ وہ اُن کے لئے ترجیح حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ پھر چونکہ سرکاری اسکول اُنہیں کامیابی کا یہ طلسم اُس خرچ کے نصف سے بھی کم پر دے دیتے ہیں جو حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے لہذا انہوں نے ہمارے طریقہ تعلیم کو پچھلے طریقہ تعلیم پر ترجیح دے رکھی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔ پھر اُس ہندوستانی مدبر کے الفاظ میں جو اُن سے بخوبی واقف تھا کہ اُن کا تعلیمی نظام اگرچہ اُس نظام تعلیم کے مقابلہ میں کم درجے پر ہے جسے ہم نے رائج کیا ہے لیکن پھر

بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے کیونکہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا۔ اُس کی بنیادیں بالکل ہی ناقص اصولوں پر نہ تھیں گو اُن کے پڑھانے کا طریقہ بہت پرانا تھا لیکن یقینی طور پر وہ ہر اُس طریقہ سے برتر تھا جو اُس وقت ہندوستان میں رائج تھا۔ مسلمان اِس طریقہ تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے۔ پھر یہی اور صرف یہی ایک واسطہ تھا جس کے ذریعہ ہندو اپنے ملک کی حکومت میں کم سے کم حصہ لینے کی صلاحیت پیدا کر سکتے تھے[1] ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے پچھتر سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے گو اس دوران میں ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے پُرانے طریقے کو خیرباد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگر مسلمان ذرا بھی عقلمند ہوتے تو وہ اس تبدیلی کو بھانپ جاتے اور اپنی قسمت پر قناعت کرتے مگر ایک پرانی فاتح قوم اپنے شاندار ماضی کی روایات کو جلد فراموش نہیں کر سکتی۔ مسلمانانِ بنگال نے اُس نظام کو ٹھکرا دیا جس سے وہ اُن لوگوں پر کوئی فضیلت نہیں رکھ سکے جو مدتوں سے ان کے محکوم تھے اور جن کو بت پرست سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا یا غلام قوم سمجھ کر نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ مزید براں مذہب نے بھی اس

---

[1] مسٹر ای سی بے کلے سی۔ ایس۔ آئی

جدید نظام کے خلاف جلتی آگ پر تیل کا کام دیا۔ مدت تک تو اس بات کا ہی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ایک مسلمان اپنی روح کو اذیت پہنچائے بغیر سرکاری اسکولوں میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ جدید نظام انگریز استادوں کے ماتحت رائج کیا جاتا یا زیادہ جرات سے کام لے کر اپنی زبان کو سرکاری زبان قرار دیتے تو مسلمانوں کی مذہبی دشواریاں کم از کم ایک لحاظ سے آسان ہو جاتیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عیسائی مذہب اگرچہ صداقت پر نہیں جیسا کہ پیغمبر اسلام واضح فرما چکے ہیں بہرکیف ایک الہامی مذہب ہے جسے انسان کے لئے نازل کیا گیا البتہ ہندو دھرم اُن کے نزدیک ایک قابل نفرت شیطان ہے بھوتوں اور بتوں کی پرستش کا ایک نظام جس میں خدائے واحد کی پہچان کے لئے روشنی کی ایک شعاع بھی نہیں ملے گی[1] جنوبی بنگال میں ہمارے سرکاری سکولوں کی زبان ہندی ہے اور معلم بھی ہندو لیکن مسلمانوں نے بُت پرستوں کی تعلیم کو بت پرستوں ہی کی زبان میں حاصل کرنے کو حقارت ٹھکرا دیا۔

لیکن اس نفرت نے رفتہ رفتہ زندگی کی بدلی ہوئی ضروریات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مذہب جس نے شروع شروع میں ہمارے سکولوں کے خلاف

---

[1] مجھے یہاں یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں اس بیان کے بالکل مخالف ہوں۔ میرے خیال میں اب تک غیر تربیت یافتہ عیسائیوں کا بھی یہی خیال ہے مسلمانوں کو ان لوگوں کے مذہب سے جس پر وہ حکومت کرتے تھے بے خبری کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔

عوام کے جذبہ نفرت وحقارت کو دو چند کر دیا تھا متذبذب ہو گیا۔ اور وقت کے سب سے بڑے عالم دین شمس الہند کے فتووں کی تاویل جن کا ذکر اس کتاب میں کئی بار آچکا ہے اس طرح کی جانے لگی کہ وہ انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں۔ اس مشہور و معروف عالم دین نے ایک فتوے انگریزوں کی ملازمت کے متعلق اس سے پہلے بھی دیا تھا۔ اُن کا فیصلہ تھا کہ بعض سرکاری ملازمتوں میں کوئی عیب نہیں بعض ایسی ہیں جو نہ اچھی ہیں نہ بُری لیکن بعض بالکل ممنوع۔ اگر انگریز مسلمانوں کو قابل تعریف کاموں کے لئے ملازم رکھیں مثلاً شرع محمدی کے مطابق مفتی، سڑکوں اور غریبوں کے لیے مسافر خانوں کے اوورسیر یا جائداد کی حفاظت اور چوروں کا قلع قمع کی خدمت تو یہ ملازمتیں جائز ہیں کیونکہ حضرت یوسفؑ مصر کے کافر بادشاہ کے خزانچی اور پولیس کے افسر اعلےٰ تھے۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے حضرت موسےٰؑ کو دودھ پلانے کے لئے فرعون کی ملازمت کی تھی۔ لیکن اگر کوئی ملازمت انسانوں کو بے دینی کی طرف لے جائے تو جو مسلمان اسے اختیار کرے گا وہ گنہگار ہو گا۔

ایسے ہی جب ان کے مریدوں نے سوال کیا کہ کیا منطق یا انگریزی کا پڑھنا جائز ہے تو انہوں نے کہا منطق اگرچہ نجات کے لئے ضروری نہیں مگر صرف ونحو کی طرح اس سے علم حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر کوئی شخص منطق کو اس لئے پڑھتا ہے کہ دین پر اعتراضات کرے تو گنہگار ہے اور اگر محض علم کی حیثیت سے

پڑھے تو پھر اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ انگریزی کو اس لئے پڑھنا کہ انسان کتابیں پڑھ سکے، خط لکھ سکے اور الفاظ کے مخفی معنوں کو معلوم کر سکے جائز ہے۔ کیونکہ زید ابن ثابت نے رسول کریمؐ کے حکم سے یہود اور نصاریٰ کی زبان اور اُن کی لغت پڑھی تھی تاکہ وہ ان خطوط کا جواب لکھ سکیں جو رسول کریمؐ کو یہود اور نصاریٰ کی طرف سے آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انگریزی زبان کو اس لئے پڑھتا ہے کہ اُس سے عیش و عشرت حاصل ہو یا اس لئے کہ انگریزوں سے اتحاد پیدا کیا جائے تو وہ گنہگار ہے اور قانون کی حد کو توڑتا ہے جیسا کہ لوہے کے ہتھیار کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس لئے بنایا جائے کہ اُس سے چوروں کو نکالا یا گرفتار کیا جائے تو کارِ ثواب ہے لیکن اگر اس لئے بنایا گیا ہے کہ ان کی مدد کی جائے تو یہ معصیت اور گناہ میں داخل ہے۔

مگر زیادہ پرجوش مسلمانوں نے سرکاری سکولوں کی تعلیم کو کبھی جائز نہیں سمجھا۔ جہاں دیندار مسلمانوں نے ہمارے سلسلۂ تعلیم سے کچھ رعائتیں کیں وہاں زیادہ متعصب لوگ اُس سے اور بھی دُور بھاگنے لگے۔ گذشتہ چالیس سال میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کر لیا ہے مثلاً اُن کا لباس الگ، سلام کرنے کا طریقہ الگ علیٰ ہذا البعض دوسرے بیرونی امتیازات جن کی اپنی عظمت کے ایام میں انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں ہمارے سکولوں میں ایک مسلمان کے مقابلے میں دس ہندو تھے اور یہ نسبت اب پہلے سے بہت

بڑھ گئی ہے لیکن اس زیادتی کی وجہ ہمارے ضلع کے سرکاری اسکول نہیں بلکہ دیگر امدادی ادارے ہیں۔ انگریزی سکولوں میں طلباء کی مجموعی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور وہ افسر جو وہابی مقدمات کا انچارج تھا اور جس کی سند پر میں یہ بیان لکھ رہا ہوں کہتا ہے کہ مسلمان طالب علموں کی تعداد کو ان کی مجموعی آبادی سے کوئی معقول نسبت نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم مسلمانوں کے تین ایسے رجحانات کو جو سراسر طبعی ہیں بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔ اول یہ کہ ذریعہ تعلیم بنگال کی دیسی زبان ہے جس سے تعلیم یافتہ مسلمان نفرت کرتے ہیں اور ماسٹر ہندو جن کو ساری مسلمان قوم حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بنگالی سکول ماسٹر جب اپنی دیسی زبان اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں گفتگو کرتا ہے تو وہ مسلمانوں کے لئے بھی ایسی ہی اجنبی ہے جیسی ہمارے لئے۔ پھر اس کے عاجزانہ اور بزدلانہ طور طریق اس قابل نہیں کہ مسلمان بچوں میں ضابطہ قائم رکھ سکے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک مسلمان زمیندار نے ایک انگریز افسر سے کہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ اپنے بچوں کو بنگالی سکول ماسٹر کے پاس بھیجے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیہاتی سکول اس قابل نہیں کہ یہاں مسلمان اُن زبانوں کو حاصل کر سکیں جو زندگی میں قابل عزت جگہ کے حصول اور مذہبی فرائض کی بجاآوری کے لئے ضروری ہیں۔ ہر شریف مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تھوڑی بہت فارسی جانتا ہو۔ لیکن فارسی وہ زبان ہے

جو ہمارے اضلاع کے اعلےٰ اسکولوں میں بھی پڑھائی نہیں جاتی۔ مسلمان خواہ دیہاتی ہو خواہ شہزادہ اس بات پر مجبور ہے کہ اپنی نماز کسی متبرک زبان یعنی فارسی[1] یا عربی میں ادا کرے مگر ان زبانوں کو ہمارے اسکولوں نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک فتوےٰ شایع ہوا تھا کہ مسلمانوں کی نماز اُس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہیں ہوگی جب تک کہ اُن کو خاص زبان میں ادا نہ کیا جائے۔ تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے ایک بہت بڑی اور طاقت ور ذات چلی آتی ہے جو بچوں کی تعلیم کے اس حصّے کو پورا کر دیتی ہے لیکن مسلمانوں میں اس قسم کی کوئی مذہبی جماعت نہیں۔ ہر مسلمان گھر کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں جو شخص سب سے زیادہ بزرگ ہے وہ مذہبی فرائض کو کماحقہٗ جانتا ہے بلکہ مذہباً پورے خاندان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نماز باجماعت مسجدوں ہی میں ادا کی جاتی ہے مگر یہ صرف اسلام ہی کی شان ہے کہ اُس میں مساجد کی تعمیر ضروری نہیں کیونکہ نماز خدا کی زمین اور اُس کے آسمان کے نیچے ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے۔ ایسی تعلیم کا طریقہ جو سراسر دنیاوی ہو بہت ہی تھوڑی قوموں کے مزاج کے مطابق ہے۔ چنانچہ

---

[1] بنگالی مسلمانوں کے نزدیک فارسی بھی بہت حد تک متبرک ہے کیونکہ اس زبان کے ذریعے اُن میں اسلام کے قوانین اور احکام پہنچے ہیں۔

بڑے بڑے قابل مدبروں کے نزدیک ایسے طریقۂ تعلیم کو آئرلینڈ میں بالکل ناکامی ہوئی۔ پھر اسلامی بنگال کے متعلق تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس جاہل اور متعصب کاشتکاروں کی افتادِ طبیعت کے سراسر منافی ہے۔

ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقۂ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو اُن کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر اُن کے مفاد کے خلاف ہے اور اُن کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

لیکن اس کے باوجود اکثر انگریزوں کی یہ عادت ہے کہ دورانِ ملازمت میں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ کے لئے غم و غصہ کے جذبات پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ کیوں اس تعلیم کو ٹھکرا رہے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جس آسانی سے ملک کی دوسری قوموں نے اس تعلیم کو حاصل کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ انکار اور بھی زیادہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ ابن الوقت ہندو کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا نہیں لہٰذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان خواہ مخواہ کیوں اپنے لئے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل ہم نے اُس امتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو بذاتِ خود اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان کا مذہبی رجحانِ طبیعت

یعنی وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اور ہر قوم میں خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے جدا رکھا۔ مشرک اپنی پرستش کے لئے بہت سے خدا رکھتے ہیں اور اس بنا پر ان کے اعتقادات کے بھی کئی ایک حصے ہو جاتے ہیں گبن نے یونانیوں کے متعلق جو آخری فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت ہندو پر کہیں زیادہ ٹھیک عائد ہوتا ہے' ناقابل تقسیم اور باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے اعتقاد پسند دل و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے۔ یونانی علم الاصنام کی بناوٹ ہزارہا قسم کے آزاد اور لچکدار حصوں کا ایک مجموعہ ہے لہذا ان معبودوں کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اور درجے مقرر کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے لیکن مسلمانوں کے لئے اس قسم کی آزادی ناممکن ہے، مذہب ان سے بغیر مشروط سرگرم حتیٰ کہ پُر تعصب اعتقاد کا خواہاں ہے لہذا جو طریقہ تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کرے کسی سچے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

حکومت کی مذہبی حیثیت کو صدمہ پہنچائے بغیر ہم مسلمانوں سے اس معاملہ میں کہاں تک انصاف کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق بعد میں بحث کی جائے گی لیکن سر دست مسلمانوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ جو روپیہ تعلیم کے لئے سرکار آبادی سے بغیر کسی امتیاز کے حاصل کرتی ہے وہ صرف ایسے طریقہ پر خرچ کیا جاتا ہے جس کا فائدہ ہندوؤں کو پہنچتا ہے

بدقسمتی سے ہمارے خلاف یہی ایک الزام نہیں جو سب سے زیادہ سنگین ہو۔ ہم نے صرف ایک ایسا طریقۂ تعلیم ہی رائج نہیں کیا جو مسلمانوں کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے۔ ہم نے اُن کے طریقۂ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا جس میں اُس کی بقا کا دار ومدار تھا مسلمانانِ بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے سکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اُس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا یہ خاندانی سکول کم ہوتے اور اُن کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے۔ یہ ہمارے عہدِ حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابلِ مدافعت قوت کو اُن کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کرتے۔ حکومتِ وقت ان معاملات پر ہمیشہ ناقابلِ سوال اور غیر مشروط اقتدار رکھتی۔ مغلوں کی بے پرواہ حکومت کے ماتحت اور اُس بدامنی کے دوران میں جس میں اس سلطنت کا خاتمہ ہوا یہ قوت کسی حد تک بارضا و رغبت اور بڑی حد تک زبردستی حاکمانِ صوبہ اور ان کے ماتحتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ دہلی کے دور دراز دربار نے اس بات کو معلوم کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ جنوبی بنگال میں کیا ہو رہا ہے۔ اُن کو غرض تھی تو صرف خراج کی وصولی سے۔ ڈھاکہ اور مرشد آباد کے گورنر بھی ویسے ہی سست اور عیاش تھے اور ضلع

کے انتظام کی تفصیلات سے بالکل بے پرواہ ۔ مالگذاری جمع کرنے والا زمیندار یا مقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے بشرطیکہ مالگذاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے ۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق مندر یا مسجد کے ساتھ کچھ علاقہ معافی کا وقف کر دیتا اور کوشش کرتا کہ ساری عمر کے ظلم و تعدی کا کفارہ بستر مرگ پر مختلف قسم کے نیک کاموں سے ہو جائے ۔

جب ہم نے صوبہ بنگال پر قبضہ کیا تو اُس وقت کے قابل ترین افسر مال[1] کا تخمینہ تھا کہ صوبے کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا ہے ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز کو اس انتہائی بے ایمانی کا حال معلوم ہوا تو ان علاقوں کی واپسی کے خلاف عوام کا جذبہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی کارروائی نہ ہو سکی ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو بڑی شد و مد سے اٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق حکومت وقت سے منظوری نہ لی گئی ہو اُس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہئے مگر اُس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس اصول پر کاربند ہونے کا حوصلہ نہ کر سکی ۔ پھر یہ معاملہ پچیس سال تک یونہی کھٹائی میں پڑا رہا اور ۱۸۱۵ء میں حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس حق پر اصرار کیا لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ آخر کار ۱۸۱۳ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا جس کے ماتحت خاص عدالتیں

[1] مسٹر جیمز گرانٹ

سفر کی گئیں اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبے میں، مخبر، جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگزاری گشت کرتے رہے۔

واگزاری کے مقدمات پر ۸ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کی مالگذاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ مستقل ہو گیا یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فیصدی سالانہ کے حساب سے۔ اس رقم کا بہت بڑا حصہ اُن زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں۔ اس سے جو انزی اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے دیہاتی دستاویزات[۱] میں ثبت ہو چکے ہیں سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ[۲] سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے لہذا جو شخص غیر جانبداری سے اس کی تحقیق کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جب واگزاری کے قوانین کا مقصد محض ایسے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پُر زور طریقہ پر اپنے لیے محفوظ رکھا تو پھر واگزاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں برتی گئی تھی درآں حالیکہ وہ ہندوستانیوں کی عام رائے کے بالکل

۱؎ فرینڈ آف انڈیا۔ ۲۰ اپریل ۱۸۶۸ء جس کے حسابات کو افسران مالگذاری نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۲؎ شروع میں واگذاری کے مقدمات میں انتہائی سختی سے کام لیا گیا تھا۔ پھر کچھ سالوں تک معمولی رفتار سے چلنے کے بعد آخرکار حکومت کے حکم سے ۷ مارچ ۱۸۶۱ء سے بالکل بند کر دیئے گئے۔

خلاف تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف اور صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم ورواج کا حق ایک غلط سی بات ہے لیکن پچھتر سال کا مسلسل قبضہ اس امر کا پرزور حق پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے واگذاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا۔ رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے، اُن دنوں کا خوف وہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے ہمارے خلاف نفرت وحقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہو گئی۔ اُس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا بنگال میں ہمیشہ کے لئے بند ہے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہنچا کیونکہ ہندوستان کے سابق فرمانرواؤں نے اپنے قبالوں سے ایسی ہی بے پروائی کی تھی جیسا کہ دوسرے معاملات میں لیکن جس کا چالاک اور ناعاقبت اندیش ہندوؤں کے ہاں کوئی امکان نہیں تھا ہم نے اُن کی معافیات کے جو ثبوت طلب کئے ان کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ قانون ملکیت غیر یقینی تھا اور اُن کی تسلیم شدہ ذاتی جائدادوں کے معاملے میں بالکل ناکارہ پچھتر سال تک ہم نے اس انتہائی بے ایمانی کو جس کے خلاف ہم احتجاج بھی کرتے رہے جاری رہنے دیا لیکن اس کی مجموعی سزا ایک ہی نسل کو بھگتنا پڑی۔ اس دوران میں بنگال کی آب وہوا اور بنگال کی دیمک ان کی سندوں اور قبالوں کا ستیاناس کرتی رہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ واگذاری میں ہمیں اُس سے بہت کم

ملا جتنا ہم سے چرایا گیا تھا لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگذاری سے ہی شروع ہوتی ہے۔ وہابی مقدمات کے ذمے دار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔

بہر حال ان مقدمات کو توحق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے اُن کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں اُن کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ۱۸۰۶ء میں ہُگلی کا ایک دولتمند مسلمان فوت ہوگیا۔ اُس نے اپنی جائداد کا بہت بڑا حصہ مصرف خیر کے لئے چھوڑا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُس کے دو امانتداروں نے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا جو ۱۸۱۰ء میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ ایک دوسرے کے خلاف بد دیانتی کے مقدمات دائر ہو گئے اس پر ضلع کے انگریز کلکٹر نے عدالت کے فیصلہ تک اس جائداد کو اپنے قبضے میں لیا۔ یہ مقدمات ۱۸۱۶ء تک چلتے رہے۔ آخر کار گورنمنٹ نے ان دونوں امانتداروں کو بے دخل کر دیا اور جائداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ایک امانتدار تو خود گورنمنٹ بن بیٹھی اور دوسرا امانتدار وہ جسے مرضی کے مطابق نامزد کیا گیا ہو۔ اگلے ہی سال اس ساری جائداد کا دوامی پٹہ لکھا گیا اور ہر دوامی

پٹہ دار سے ایک معقول رقم حاصل کر لی گئی۔ ان اداشدہ رقوم کی میزان معہ اُس آمدنی کے جو دوران مقدمہ میں جمع ہوتی رہی، ایک لاکھ ستاون ہزار پونڈ[1] سے (تقریباً اکیس لاکھ روپیہ) مزید برآں ۱۲ ہزار پونڈ (تقریباً ڈیڑھ لاکھ) سے کچھ اوپر کی رقم وہ جو اس وقت تک جائداد مذکورہ کی سالانہ آمدنی سے بچائی گئی۔

جیساکہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں یہ وقف مصرف خیر کے لئے کیا گیا تھا اور اس کے مصارف وصیت نامہ میں درج بھی تھے۔ مثلاً بعض مذہبی فرائض اور رسوم کی ادائیگی، امام باڑہ یعنی ہگلی کی عظیم الشان مسجد کی مرمت، ایک قبرستان، بعض وظائف اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی ادارے وغیرہ وغیرہ ایک تعلیمی ادارہ بھی اس وصیت کے مقاصد کے تحت میں آتا تھا مگر وہ تعلیمی ادارہ ایسا ہونا چاہیے تھا جو مسلمانوں کے خیال کے مطابق ہو جیساکہ وصیت کرنے والے نے خود منظور کیا ہوتا۔ اسلامی ممالک میں غریب و نادار لڑکوں کے لئے کالج قائم کرنا ہمیشہ ایک نیک کام سمجھا جاتا ہے مگر اس سرمایہ سے ایک غیر مسلم کالج بنانے کی ہر کوشش وصیت کنندہ کی منشار کے مطابق ایک الحادی کام تھا اور اس سے امانتداروں کی سخت بددیانتی کے سوا اور کچھ متصور نہیں ہوتا۔ دراصل اسلامی اوقاف سے مذہب اس قدر لازم و ملزوم ہے کہ حکومت کو ایک معزز شیعہ کے قائم کردہ وقف سے سنیوں کی تعلیم پر خرچ کرنا بھی

---

[1] کالج کی عمارت اسی رقم سے بنائی گئی تھی

پوری چھان بین کے بعد چاہیئے۔

اب ہم اُس غم و غصہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر اس بات سے پیدا ہو کہ انگریزی حکومت ایک انگریزی کالج کی تعمیر سے اس سرمایہ کو غلط استعمال کرتے والی ہے۔ بہر حال اُس نے ایسا ہی کیا اور اس جائداد کو جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مصرف خیر پر خرچ کرنے کے لئے وقف کی گئی تھی ایسے ادارے میں صرف کر دیا جو اپنی ساخت ہی میں اسلامی اصولوں کے خلاف تھا اور جس سے مسلمان عملی طور پر مکمل خارج ہو گئے۔ اس وقت اس کالج کا پرنسپل ایک معزز انگریز ہے جو عربی اور فارسی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا۔ وہ ایک خالص اسلامی وقف کو ایسی تعلیم میں صرف کر رہا ہے جس کو ہر مسلمان نفرت سے دیکھتا ہے اس کی تنخواہ پندرہ سو پونڈ سالانہ ہے مگر یہ اُس کی غلطی نہیں اگر یہ غلطی ہے تو اُس حکومت کی جس نے اس کو اس عہدے پر مقرر کیا ہے اور جو پینتیس[۳۵] سال سے متواتر اس بہت بڑے تعلیمی فنڈ کا جان بوجھ کر غلط استعمال کر رہی ہے انگریزی کالج کے ساتھ ایک چھوٹے سے اسلامیہ سکول کا قائم کر دینا اس انتہائی بد دیانتی کو چھپانے کی ایک فضول سی کوشش ہے۔ کالج کی عمارت میں جمع شدہ سرمایہ کے غلط استعمال کے علاوہ اس میں سے ہر سال پانچہزار پونڈ کالج پر خرچ کر دیتی ہے۔ گویا پانچہزار دو سو ساٹھ پونڈ کی سالانہ آمدنی میں سے صرف تین سو پچاس پونڈ اُس اسلامیہ سکول پر خرچ کئے جاتے ہیں جو اس وقف کے

اصلی مصرف کی واحد یادگار ہے۔

اس بددیانتی کے الزام پر زیادہ کچھ لکھنا تکلیف دہ ہے کیونکہ اُس کی تردید کی کوئی صورت نہیں مسلمان علانیہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انگریزوں ہی نے مسلمان امانتداروں کی بدعنوانیوں سے فائدہ اٹھایا اور ان کے بڑے بڑے مذہبی اوقاف کو کافر حکومت کے ہاتھ میں دے دیا جو اُس وقت سے مصرف خیر کی بجائے جیسا کہ مسلمان وصیت کنندوں کا اصلی مقصد تھا ایک ایسے ادارے پر خرچ ہو رہے ہیں جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یوں ان کی ابتدائی غلطی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چند سال ہوئے اس انگریزی کالج کے تین سو طلباء میں سے ایک فی صدی بھی مسلمان نہ تھے اور گو یہ شرمناک تناسب اُس وقت سے بتدریج کم ہو رہا ہے لیکن مسلمانوں کے دلوں میں اس بے انصافی کا خیال بدستور باقی ہے۔ ایک سول افسر جس نے اس معاملہ کا بغور مطالعہ کیا ہے لکھتا ہے "مجھے یقین ہے کہ اُس حقارت اور بے عزتی میں مبالغہ سے کام لینا بہت ہی مشکل ہے جو برٹش حکومت نے خود اپنے طرزِ عمل سے پیدا کر رکھی ہے"۔ اس فقرے کی زبان کو شاید بہت سخت کہا جائے لیکن مجھے خود بھی اس حقیقت کا اعلان کرنا ہے کہ اپنے اٹھائیس سالہ قیام ہندوستان میں میں نے اس سوال کو حل کرنے کی بار بار کوشش کی (ہندوستان آنے کے بعد میں چند ہفتوں ہی میں ہُگلی گیا تھا) اور واقعہ

یہ ہے کہ ہیں نے ہندوستانیوں اور انگریزوں سے ان حالات کے ماسوا اور کچھ نہیں سُنا۔ یہ بات صحیح ہو یا غلط مگر مسلمانوں کو بہرحال یقین ہے کہ حکومت نے اس معاملہ میں اُن سے ایک بہت بڑی ناانصافی ہی نہیں کی بلکہ کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جذبات افسوس اور شکایت اسی طرح قائم ہیں۔

لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں اُن پر مسدود کر دی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم نے اُن کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم اُس غم و غصہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اُس وقت ہو گا جب کہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپنے مذہبی تہواروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کے متعلق بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ہم نے ان جذبات کا احترام کیا ہے لیکن معلوم نہیں جنوبی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ عرصے سے کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے اوّل تو ان کی مذہبی ضروریات سے تدریجاً اغماض کیا پھر ان کو بالکل بھلا دیا اور آخر کار اُن سے قطعی منکر ہو گئے۔ پچھلے سال کلکتہ ہائی کورٹ کے مسلمان وکلا نے

اس بارے میں دو عرضداشتیں بھیجی تھیں۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دی جاتی ہیں اور ہندوؤں کو باون تو پھر مسلمانوں کو بارہ کیوں ملتی ہیں اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے منظور شدہ چھٹیاں اکیس[۲] تھیں۔ اس کے باوجود عرضی گزاروں کی التماس یہ تھی کہ اُن تعطیلوں کی کم سے کم تعداد کو جواب گیارہ تک پہنچ چکی ہے اور کم نہ کیا جائے اس میموریل کا یہ اثر ہوا کہ گورنمنٹ نے ایک حکمنامہ جاری کیا کہ آئندہ ہائیکورٹ میں بھی اتنی ہی چھٹیاں ہونی چاہیئں جتنی کہ گورنمنٹ کے دفاتر میں ہوتی ہیں۔

اب گورنمنٹ دفاتر میں کسی اسلامی تہوار پر چھٹی کی اجازت ہی نہیں البتہ ہر محکمہ کے افسر کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ماتحت مسلمانوں کو اُن کے چھ بڑے تہواروں پر غیر حاضر ہونے کی اجازت دے دے اس طرح کہ سال میں کل بارہ چھٹیاں ہو جائیں مگر دفتر بدستور کھُلے اور روزانہ کام حسب دستور جاری رہے۔

لیکن مسلمان وکلاء نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس قسم کی اجازت سے ہائی کورٹ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ عدالتوں کو صرف اپنے افسروں اور وکیلوں کا خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ عوام الناس کا بھی جن کی سہولت کے لئے ان کا وجود قائم ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ گو مسلمان وکیلوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی ہو گئی ہے لیکن مقدمہ باز مسلمانوں کی تعداد اُس تناسب سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ریل کے جاری ہونے سے وہ اپنے

مقدمات کی نگرانی کے لیے بہ آسانی آجا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان پلیڈروں کو اسلامی تہواروں پر حاضری سے معاف کر دیا جائے تب بھی وہ اپنی توجہ اُن مقدمات کی طرف سے ہٹا نہیں سکتے جو اس دوران میں جاری رہیں گے کیونکہ اُن کے ساتھ ہندو اور انگریز پلیڈر بھی مقدمے میں پیش ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ اس حکم سے اُن کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممانعت اس حکم کی بہتر سالہ روایات کے بالکل خلاف ہے اور اُن کو مذہبی فرائض کی بجا آوری سے باز رکھتی ہے۔ اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو اُن کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو آپ کے سائل عرض پرداخت ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی؟[۵]

گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔ بہر حال یہ جاننا تسلی بخش ہے کہ اور نہیں تو اس بے انصافی پر عمل درآمد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومت اعلیٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے۔ یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے مگر اتنے ضرور تھے جو ان کے مذہبی تہواروں کے لئے کافی ہوں اور سرکاری کام کی ضروریات بھی اُن کی اجازت دے سکیں۔

---

۵ ہائی کورٹ کے مسلمان پلیڈروں کا میموریل جو انہوں نے چیف جسٹس اور اُس کے ہمراہی ججوں کے سامنے پیش کیا۔

ایک الزام ابھی باقی ہے مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے اُن کو قانونی پیشہ ہی سے خارج نہیں کر دیا بلکہ مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رُو سے ان کے مذہبی اور شخصی قوانین کو پورا کرنے والے ضروری منصب داروں سے بھی محروم کر دیا ہے اسلامی حکومت میں قاضی کے فرائض منصبی میں فوجداری دیوانی اور شرعی عدالت کے فرائض داخل تھے۔ پہلے پہل جب ہم نے ملک پر قبضہ کیا تو عدالتی نظام کو جاری رکھنے کے لیے بڑی حد تک انہیں پر بھروسہ کیا تھا۔ ہمارے سب سے پرانے قوانین میں ان کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہم نے قاضی کے عہدے کو برقرار رکھا تھا۔ اس کے فرائض کے متعلق پچیس ۲۵ واقعات کی طویل فہرست ہندوستان کی قانونی کتابوں میں اب بھی مل سکتی ہے[1]۔ حقیقتاً قاضی کی حیثیت مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قوانین میں اس قدر ضروری ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہو گیا تھا کہ جب تک قاضی برقرار رہیں گے ہندوستان دارالسلام کہلاتا رہے گا لیکن جب ان کو علیحدہ کر دیا گیا تو یہ ملک دارالحرب بن جائے گا۔ مسلمانوں کی بے اطمینانی سے ہم اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کی تحقیقات کریں۔ بدقسمتی سے ان تحقیقات کی ابتدا بہت تھوڑے دنوں سے ہوئی ہے ۱۸۶۳ء میں صوبجات کے گورنروں میں سے ایک نے اعتراض کیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت

---

[1] بنگال کورٹ آرڈر نمبر ۹۳ ۱۷۹۳ء و آر XII ۱۷۹۳ء وغیرہ

ان کی مقدس حیثیت کو تسلیم کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مسلمانوں کو اس امر کا حق دیتے ہیں کہ وہ ان کا تقرر بطور خود کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بہت کچھ بحث و تمحیص اور حکومت مبئی کی طرف سے پُرزور احتجاج کے بعد اس مضمون پر تمام سابقہ قوانین منسوخ کردیئے گئے اور حکومت نے قاضیوں کا باقاعدہ تقرر بند کردیا۔[1] اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پچھلے سات سال سے مسلمانوں کا بہت بڑا اور ہمیشہ بڑھتا ہُوا حصہ ایک ایسے عہدے دار سے محروم ہوگیا جس کا وجود شادی بیاہ اور دوسری خاندانی رسم و رواج کو منانے کے لئے ازحد ضروری ہے۔ شروع شروع میں اس مصیبت کا احساس زیادہ نہیں ہوا تھا کیونکہ پرانے قاضی ابھی موجود تھے اور قانون مذکور کا اطلاق صرف اس وقت ہُوا تھا جب کوئی قاضی مرجاتا یا پنشن پا لیتا اور پھر اُس کی جگہ از روئے قانون پُر نہیں کی جا سکتی تھی۔ اوّل اوّل موجودہ وائسرائے نے اس معاملہ پر غور کرنا شروع کیا تھا۔ مگر کوئی قطعی فیصلہ کئے بغیر پھر ۱۸۸۰ء میں مدراس ہائی کورٹ نے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس کا فیصلہ کردیا۔ مسٹر جسٹس کوبٹ[2] کے فیصلہ کے بعد شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صرف حکومت وقت ہی قاضیوں کو مقرر کر سکتی ہے۔ اگر قاضی کا تقرر نہ ہو تو مسلمان اس بات کے

---

[1] ایکٹ نمبر ۱۲ ۱۸۶۴ء جو بعد میں ۱۸۶۸ء کے ایکٹ نمبر ۸ کے ضمیمہ کی رو سے منسوخ کردیا گیا تھا۔ مگر اس نے اُن قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا۔

[2] اصل مقدمہ نمبر ۳ ۲۵ محمد ابوبکر مخالف میر غلام حسن اور انور۔

مجاز نہیں کہ از خود کسی کو قاضی منتخب کرلیں۔ گویا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نے اس قوم سے اُن کے قوانین کا ایک اہم عہدیدار چھین لیا۔ جس کے فرائض تھے انتقال ناموں کی تشہیر و تعریف عقد نکاح اور دوسرے مذہبی فرائض اور مراسم کی بجا آوری۔ اب صورت حالات یہ ہے کہ جنوبی بنگال میں سب سے بڑی مصیبت جو ایک مجسٹریٹ پر آسکتی ہے اور جس سے چھٹکارا پانے کا اسے کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات کچھ عرصے سے بہت ہی نازک ہو گئے ہیں۔ زناکاری اور اغوا کے مقدمات (یہ دونو تعزیرات ہند کے ماتحت آجاتے ہیں) اضلاع دہانہ کی عدالتوں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں۔ ان دنوں مقدمات میں سے نو ایسے ہوتے ہیں جن میں نکاح کو قانونی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ شرقی بنگال کے دو حلقوں میں ۱۸۶۱-۱۸۶۲ء کے اندر یعنی جب حکومت نے قاضیوں کا تقرر بند کردیا ہے اس سے دو سال پہلے کل مقدمات کی تعداد ۱۶۵ تھی۔ ۱۸۶۵-۱۸۶۶ء میں یعنی قاضیوں کا تقرر بند ہو جانے کے دو سال بعد یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۹۰۴ تک پہنچ گئی۔ لیکن اس وقت سے فوجداری اعداد و شمار میں اُن کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ واقعۃً نہیں بلکہ اس لیے کہ اب یہ دستور ہے کہ ایسے مقدمات کو دیوانی عدالت میں منتقل کر دیا جاتا ہے[1]

۱؎ ازدواجی مقدمات کے بڑھ جانے کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ اب لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ تعزیرات ہند سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ہم نے ازدواجی تعلقات (باقی برصفحہ ۲۸۱)

یہ اعداد و شمار وہابی مقدمات کے ذمہ دار افسر کی قیمتی دستاویزات سے لیے گئے ہیں۔ اس بھی زیادہ قابل اعتماد اور تجربہ کار افسر نے قاضیوں کی اسامی کو سرکاری طور سے اُڑا دینے پر جو یاسی خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ یوں رائے زنی کی ہے:۔

"میرا خیال ہے کہ اُن کی برطرفی یقیناً وہابی تحریک پر دو پہلوؤں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سے ان پرجوش پڑھے لکھے اور قدرے تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جو کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات سے نالاں ہو کر جاہل مسلمانوں میں بغاوت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے مطابق بسر کرسکیں اُن کی اجازت بعض مذہبی مراسم ہی کے لیے ضروری نہیں مسلمانوں کو روزمرہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے شرعی مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل صرف قاضی ہی کرسکتا ہے۔ اس قسم کے منصب کی غیر موجودگی میں ہر اُس شخص کو جو حکومت کا وفادار نہیں مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کا بہت کافی موقع مل جاتا ہے کہ موجودہ حکومت اس قابل ہی نہیں کہ ہم اس کے ماتحت اچھی زندگی بسر کرسکیں۔ برعکس اس کے حکومت

(بقیہ صفحہ ۲۸۰) میں رخنہ اندازی کو ذوجداری گناہ قرار دے دیا ہے۔ اب یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ آئندہ اچھی قوانین زیادہ وضاحت کے ساتھ بنائے جائیں۔ ہم نے مسلمانوں کے قاضیوں کو برطرف کرنے کے لیے ایسا بُرا وقت منتخب کیا ہے کہ اس سے بُرا وقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

کے مقرر کردہ قاضیوں کو ماننا اور اُن سے کام لینا فی الحقیقت اس حکومت کے با اختیار اور جائز ہونے کا اعتراف کرنا ہے"۔

یہ سوال اُن تمام سوالوں سے اہم ہے جو اب تک مجلس وضع قوانین میں پیش ہو چکے ہیں لیکن اس کے متعلق کوئی صحیح نتیجہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس سوال کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح سے غور و خوض کر لیا جائے۔ پھر اُن دس صوبجاتی حکومتوں سے بھی مشورہ لینا ضروری ہے جن میں ہندوستان تقسیم ہے۔ موجودہ وائسرائے کا دیانتدارانہ رویہ جس پر وہ سختی سے قائم ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گذشتہ غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت کا مسلمانوں سے ہر قیمت پر انصاف کرنے کا عزم اس امر کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ یہ الزام بھی انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کے عائد کردہ الزامات کی فہرست سے بہت جلد خارج ہو جائے گا۔

جنوبی بنگال کے مسلمانوں سے جس حقارت اور لاپروائی کا سلوک پچھلی نصف صدی سے ہو رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی موجودہ ادبیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مشرق کے سابق فاتحین ہمارے شرقی ماہانہ رسالوں اور کتب خانوں سے اسی طرح خارج کر دیے گئے ہیں جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں سے سابقہ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بڑی عقلمندی سے ہندو اور مسلمانوں کو اپنی عنایات سے یکساں طور پر نوازا تھا۔ ہندوستانی مخزن العلوم کے سلسلہ میں

جس حیرت انگیز عربی اور فارسی دانی کا ثبوت دیا گیا تھا وہ اُس وقت کی سیاسی غیر جانبداری کا ادنیٰ سا پہلو تھا۔ مگر گزشتہ پچاس سال سے ہندو مسلمانوں کو حکومت کی ملازمتوں اور حکومت کے پیدا کردہ لٹریچر سے یکساں طور پر خارج کر رہے ہیں اور چھ سو پونڈ کی سالانہ رقم جو کورٹ آف ڈائرکٹر ہندوستانی مخزن العلوم کے لئے دیا کرتے تھے بنگال کی حاکمانہ نوازشات کی طرح یکطرفہ خرچ کی جا رہی ہے ۱۸۴۷ئہ سے ۱۸۵۲ئہ تک ڈاکٹر روئر (ROER) کے زمانے میں غیر آریائی علوم کے متعلق کوئی خاص کام نہیں ہُوا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اشپرنگر (SPRENGER) کے مختصر عہد میں اس کا ردِ عمل بھی شروع ہو گیا اور دو نہایت ہی اہم کتابیں شروع کی گئیں جو آج تک نامکمل پڑی ہیں۔

ڈاکٹر ہورس ہیمن ولسن کی سنسکرت دانی کے ذوق و شوق نے اس امداد کا عربی ادبیات پر خرچ ہونا برداشت نہیں کیا۔ ان کے سمجھانے بجھانے پر کورٹ آف ڈائرکٹر نے ایک فرمان جاری کیا کہ ہندوستانی مخزن العلوم کی تمام کوششیں ہندوستانی مباحث پر مرکوز ہونی چاہئیں ورنہ ۶۰۰ پونڈ کی سالانہ امداد بند کر دی جائے گی۔ اس وقت شاید یہی بہتر تھا کہ ایسے اخلاقی جرات رکھنے والے اور اپنے مضمون میں لائق ترین انسان کی بات عارضی طور پر مان لی جائے کیونکہ ڈاکٹر ایچ۔ ایچ ولسن ہی نے موجودہ سنسکرت ادبیات

کی بنیاد رکھی جس پر اب ماکس مُلر (MAX MULLAR) استادانہ کام کر رہا اور ایسی شاندار اور ضیا پاش عمارت کے بلند سے بلند درجے تعمیر کر رہا ہے کہ اس سے پہلے کسی عالم نے ایسی کوشش نہیں کی تھی پھر گولڈ اسٹوکر (GOLD STUCLER) اور اوفرشٹ (AWFRCLET) فیزورہال (FETZED WORD HALL) اور میور (MUIR) ایسے فضلا اُس کی بنیادوں کو اور زیادہ مضبوط کر رہے ہیں اور اس کے پشتوں اور بازوؤں کو مستحکم سے مستحکم تر بنا رہے ہیں تاکہ یہ خوبصورت عمارت بقائے دوام حاصل کرے۔

مگر عربی علوم کے ماہرین کا ایک چھوٹا سا گروہ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور اپنی حیثیت کی آخر دم تک مدافعت کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ہر اُس کام کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا جو خالص ہندوستانی نہ ہو۔ عربی علوم کے ماہرین اس معاملہ میں زیادہ کامیابی کے ساتھ جھگڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے عربی مباحث کو بالکل چھوڑ دیا اور اسلامی سلطنت کی تاریخی ادبیات میں پناہ لی۔ سر ہنری ایلیٹ (SIR HENIRY ELLIOT) سب باتوں سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں مشغول رہا۔ مسٹر تھومس (THOMAS) مسٹر ہیمنڈ (HAMOND) سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) اور کچھ اور سول افسروں سے مل کر ایک شاندار جماعت بنائی۔ اس طرح جو کچھ دور دراز کے کورٹ آف وارڈوز نے اُن سے چھینا تھا انھوں نے مقامی حکومت

سے حاصل کر لیا۔ ۱۸۵۵ء میں شمال مغربی صوبجات کے لفٹننٹ گورنر نے حکومت
کے خرچ پر فارسی مسودات کو جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک ہی کوشش
میں سٹرسٹھ مسودات حاصل ہو گئے سر ہنری ایلیٹ (SIR HENRY ELLIOT)
کی تصانیف جو مسٹر تھامس اور پروفیسر ڈوسن (DOWSON) اور مسٹر بیمز
کی قابل تعریف مگر ذرا بے پرواہ ادارت میں شائع ہوئیں وہ ترقی کی طرف
بہت بڑا قدم سمجھی جاتی تھیں۔ پھر لکھنؤ کے اسلامی مطابع بھی ہر سال مختلف قسم
کی کتابیں شائع کر رہے ہیں گو اُن کی طباعت میں اچھی طرح غور و خوض نہیں
کیا جاتا۔ کرنل ناسان لیز (NASSAN LEES) نے اپنا تمام اثر و رسوخ اور علم
اس تحریک کے لئے وقف کر دیا ہے اور انڈیا آفس کے نئے لائبریرین ڈاکٹر
روسٹ (ROST) کی ذات میں مستشرقین کو ایک ایسا نایاب فاضل ہاتھ
آگیا ہے جس میں بہت سی علوم و فنون کے ساتھ دقیق نظری اور کامل اعتمادی جمع
ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا ردِ عمل نمایاں ہے اور مسٹر بلوک مین کی
شخصیت میں ایک ایسا فاضل پیدا ہو گیا ہے جس کی محنت، ذہانت اور مشرقی
علوم کی تحصیل کا شوق پرانے زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

میں نے مسلمانوں کی عرضداشت اور حکومت برطانیہ کے خلاف ان کی شکایات
کو بیان کر دیا ہے۔ بد دیانتی اور مخصوص ناانصافیوں کے الزامات کے متعلق کارروائی
کرنے کو بغیر کسی خدشہ کے حکومت پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایسی حکومت جو گذشتہ دو سال

سے نواز بداعتمادی اور اس کے اسباب کو دور کرنے کے لئے اپنے اخلاص کا اظہار کر رہی ہے مگر عام لاپروائی کے غیر معقول الزامات کے متعلق میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا اگر ہم ان الزامات کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارا طریقہ تعلیم ہی ان سب باتوں کی جڑ ہے مسلمانان بنگال کامیاب زندگی بسر کرنے یا حکومت کی سرپرستی میں مناسب حصہ حاصل کرنے کی اُس وقت تک کوئی اُمید نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کریں اور وہ اپنے آپ کو اُس وقت تک اس قابل نہیں بنا سکتے جب تک ہمارے سکولوں میں اُن کی تعلیم کا بہتر انتظام نہ کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے جو تبدیلیاں درکار ہیں وہ بالکل آسان اور کم خرچ ہیں۔ اُن کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر میں اس کوشش کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اب تک ہم نے اس سلسلہ میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے متعلق اپنے فرائض کی ادائیگی کامیابی سے نہیں کی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن تکالیف اور ناکامیوں کو بھی بیان کر دیا جائے جو اُن کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کی کوشش میں پیش آئیں۔ گذشتہ نوّے سال سے ہم کلکتہ میں ایک اسلامیہ کالج حکومت کے خرچ سے چلا رہے ہیں[۱]۔ رفاہ عام کی دوسری کوششوں کی طرح جو انگریزوں نے کیں اس کی بنیاد بھی وارن ہیسٹنگز ہی نے رکھی ۱۷۸۱ء میں گورنر جنرل نے اُس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے جو مسلمانوں

---

[۱] جو بنگال میں مدرسہ کے نام سے مشہور ہے

کی فلاح و بہبود کے متعلق لامحالہ ہونے والی تھی یہ کوشش کی کہ ان کو پیش از وقت اُس کے لئے تیار کیا جائے۔ جوں جوں بڑے بڑے مسلمان خاندانوں کی مالی حالت کمزور ہوتی گئی اُسی تناسب سے اُن کی وہ طاقت بھی کم ہوتی گئی جس سے وہ اپنی اولاد کو حکومت کے بڑے بڑے عہدوں کے لئے تعلیم دلا سکتے تھے۔ اُن کو زیادہ مواقع بہم پہنچانے کے لئے وارن ہیسٹنگز نے دارالخلافہ میں ایک اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی اور مصارف کے لئے ایک جاگیر بھی ہمیشہ کے لئے وقف کر دی۔ لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس کا انتظام مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دیا لہٰذا اُس میں آج بھی فارسی اور عربی پڑھائی جاتی ہے حالانکہ بہت عرصہ ہوا فارسی و عربی کے ذریعے سرکاری ملازمت سے روٹی کمانا ناممکن ہو گیا ہے اس کالج میں ہر قسم کی بدعنوانیاں جاری ہیں جن کو دیکھ کر ۱۸۱۹ء میں ایک اور کوشش کی گئی اور وہ یہ کہ اس ادارے کو وقت کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنا دیا جائے چنانچہ انگریزی تعلیم کے لئے ایک درجہ اور کھولا گیا مگر بدقسمتی سے پھر جلد ہی اسے توڑ بھی دیا گیا تین سال بعد ایک اور مگر زیادہ مستقل کوشش کی گئی مگر اُس کے نتائج بھی غیر تسلی بخش رہے۔ اس کے بعد چوتھائی صدی تک اس کالج کی قسمت وہی رہی جو پوری مسلمان قوم کی ہے۔ مطلب یہ کہ اُسے بالکل فراموش کر دیا گیا پھر اگر مقامی حکومت کبھی اُس کے متعلق لب کشائی کرتی بھی ہے تو اُس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُسے بند کر دینے کے لئے بے چین ہے آخر ۱۸۲۹ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان حکومت اس ضرورت کی طرف متوجہ

ہوئی کہ اس ادارے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے جو اب عام بدنامی کا باعث ہو رہا ہے۔ اُس وقت جو تجاویز پیش کی گئی تھیں[1] ان کا لب لباب یہ تھا کہ کالج کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے نیچے درجہ میں جس کا نام اینگلو پرشین برانچ تھا اردو فارسی اور درمیانہ درجہ کی انگریزی کی تعلیم ہو[2] اور اونچے درجہ میں صرف عربی کی۔ اس تجویز کے عیوب جلد ظاہر ہو گئے۔ جس وقت نوجوان خالص عربی جماعت میں جاتے تھے تو جو کچھ انہوں نے نچلے درجے کے متفرق شعبے میں پڑھا ہوتا بالکل بھول جاتے۔ ۱۸۵۱ء میں اس سلسلہ کے نتائج کو اس طرح بیان کیا گیا "کالج نے بہت تھوڑے فاضل پیدا کئے ہیں اور وہ اپنے محدود دائرے میں اچھے ہیں۔ مگر عام یا سرکاری ملازمتوں کے مقابلہ میں جگہ پانے کے ناقابل لہذا وہ ایک ایسی جماعت بن گئے جو متعصب مغرور، مایوس اور غدار نہیں تو ناراض ضرور تھی[3]"

اس کالج کی اصلاح کے لئے پھر ایک کوشش کی گئی تھی جس میں سال دو سال کے لئے تھوڑی بہت کامیابی ہوئی مگر تھوڑے ہی دنوں میں وہ پرانی حالت پر آگیا۔ ۱۸۶۹ء میں بنگال گورنمنٹ نے ایک کمیشن جو ابھی تک اپنے اجلاس منعقد

---

[1] مرتبہ مسٹر جے۔ آر۔ کولون۔ وہ ایک ایسا شہری تھا جس کو مسلمان قوم کا اعتماد حاصل تھا اور وہ اپنی فارسی اور عربی دانی کی وجہ سے اس کا مستحق بھی تھا۔ مسٹر تھامسن کے مرنے کے بعد وہ شمال مغربی صوبجات کا لفٹنٹ گورنر بن گیا تھا اور غدر کے زمانہ میں قلعہ آگرہ میں مرگیا۔ [2] کلکتہ یونیورسٹی کے معیار انٹرنس تک

[3] مسٹر ای سی بے لے جس کی تحریروں سے میں نے بہت سے خیالات اس باب میں نقل کئے ہیں۔

کر رہا ہے اس غرض سے مقرر کیا کہ اُس کی کمزوریوں کے اسباب کی تحقیقات کرے حقیقت یہ ہے کہ اسلامیہ کالج نے اپنے طلبا کو نہ تو یونیورسٹی کے لیے تیار کیا اور نہ زندگی میں سرگرم حصہ لینے کے لیے۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک مشہور مسلمان مصلح نے کہا ہے اس تمام طریقہ نے اُن کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنائے رکھا ہے صرف عربی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ اُس انگریزی تعلیم کے فوائد سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو پہلے اُن کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ کالج میں انگریزی تعلیم کو جاری رکھنے کا کوئی انتظام نہیں پھر جو تھوڑی بہت انگریزی انھوں نے پڑھی تھی وہ چند ہی دنوں میں اُن کے دل سے محو ہو جاتی ہے

اب میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس قدر مخلصانہ کوشش سے اس قدر افسوسناک نتائج کیوں برآمد ہوئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شروع ہی سے اس کالج کی نگرانی بالکل ناقص تھی حتیٰ کہ اُس تھوڑے سے وقفہ میں بھی جب ایک انگریز پرنسپل کام کرتا تھا اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ اُس کا تقرر اور اُس کا اختیار محض نمائشی تھا۔ وہ اصل میں بعض دوسرے اہم محکموں کا انچارج تھا اور بنگال کے سب سے بڑے اسلامیہ کالج کے پرنسپل کا اعزازی عہدہ اُس کے نام سے وابستہ کرتے ہوئے اس کی ماہانہ تنخواہ میں معمولی سا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر موجودہ پرنسپل کا اصلی عہدہ سکریٹری بورڈ امتحانات کا ہے۔ اُس کو پریذیڈنسی کے تمام فوجی افسروں کا امتحان لینا پڑتا تھا جو اپنے عہدوں پر

تقرر حاصل کرنے کی قابلیت کے لیے سول عہدہ داروں کے ساتھ جو اعزازاً دیسی زبانیں سیکھتے ہیں تعلیم حاصل کرتے تھے وہ حکومت کے محکمہ داخلیہ کا قائمقام اسسٹنٹ سکرٹری اور مترجم بھی ہے اور اس کے علاوہ ایسے کام بھی کرتا ہے جو وقتی طور پر اس کے سپرد کردیئے جائیں۔ مثلاً کسی کمیٹی یا حکومت کی طرف سے متفرق تحقیقات۔ مگر اس کے علاوہ وہ محمڈن کالج کا پرنسپل بھی ہے۔ لیکن وہ اپنے مختلف فرائض کے اس حصے کو کتنے بھی انہماک سے کیوں نہ ادا کرے اس نظام سے کسی مستقل فائدے کی امید رکھنا عبث ہے۔

کالج کا اندرونی نظام اس سے بھی بدتر ہے۔ ایک قابل اور سرگرم فاضل ایک ادنےٰ شعبہ کا صدر ہے لیکن اس کا اختیار اُس جگہ پر آکر ختم ہوجاتا ہے جہاں اس قسم کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے یعنی اعلےٰ عربی محکمہ میں یہ وہ محکمہ ہے جس پر تمام ادارے کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ اس کا انتظام ملک کے مولویوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ متذکرہ بالا حضرات میں سے ایک کو باقی تمام اُستادوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کو ہیڈ مولوی کہتے ہیں مگر اس کے ماتحت کوئی نظام قائم نہیں کیا گیا نہ اُستاد اس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس ہیڈ مولوی کا سارا وقت اپنے درجے میں گذرتا ہے[1] سکول میں کوئی ماہانہ یا سہ ماہی امتحان نہیں ہوتا نہ کسی

---

[1] ممکن ہے کہ کمیشن کے تقرر نے ان حالات اور آئندہ بیان کردہ حالات کو بدل دیا ہو۔ مگر میں اپنے بیانات کی سچائی کی ضمانت دینے کے لئے تیار ہوں کمیشن کے تقرر سے پہلے کالج کی یہی حالت تھی۔

درجے کا روزانہ یا ہفتہ وار معائنہ اندریں حالات صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کا انتظام کسی فائدے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ پرنسپل کو یہ فرصت نہیں کہ صحیح معنوں میں درسگاہ کی نگرانی کرے کیونکہ اسے اور بھی بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں اور ہیڈ مولوی نے کبھی نگرانی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس روش کے عملی نتائج عیاں ہیں۔

اس بے احتیاطی سے بنگال کے مسلمان نوجوانوں میں جو نقص پیدا ہو گئے ہیں اُن میں مبالغہ کرنا ناممکن ہے۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک نسل گزری جب ہم نے ہنگامی کے وقت میں مدد مانگی تھی اور اب کلکتہ کالج ہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔ ہم نوجوان مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو تعداد میں سو سے کم نہیں ہوتی ایک عیاش مشرقی دارالخلافہ میں جمع کر دیتے اور اجازت دیتے ہیں کہ وہ سال تک بُرے سے بُرے اثرات قبول کرے ان کے چال چلن کی نگرانی نہیں کی جاتی ان کے ماحول میں باعزت اثرات کی کوئی مثال نہیں ملے گی آخرالامر زندگی کے کسی شعبہ میں عملاً حصہ لینے کے قابل بنائے بغیر انہیں گاؤں میں واپس بھیج دیتا ہے ان طلباء میں سے اسی فیصدی متعصب مشرقی اضلاع سے آتے ہیں۔[۵۷] بنگال کے زیادہ وفادار حصوں کے نوجوان اس کالج میں اس لئے نہیں آتے کہ انگریزی تعلیم کے بغیر اچھی آمدنی کی ملازمت کا ملنا دشوار ہے۔ یہ طالب علم اپنے لڑکپن کا زمانہ بے اطمینانی کے ماحول میں بسر کرنے

---

۵۷ اکثریت چٹاگانگ، سانڈپ اور شاہبازپور سے آتی ہے۔

ہیں۔ اُن میں سے بہت سے غریب ہوں گے اور جب کلکتہ آئیں گے تو انگریزوں کے خانساماؤں کے گھروں میں پڑے پڑے ان کی خیرات پر بسر اوقات کریں گے [1]۔ یہ خانساماں لوگ مسلمانوں میں کافی مال و دولت رکھتے ہیں اور ادنیٰ ملازمین کی اُس دبی ہوئی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ جو غلام قوم کا خاصہ ہے اپنے آقاؤں کی ان کی پیٹھ پیچھے تحقیر کرتے رہتے ہیں۔ پھر طالب علم کی عمر بالعموم سولہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی گو بعض کی بیس سال سے اوپر لیکن مجھے بتلایا گیا ہے کہ ان میں تیس تیس برس کے طالب علم بھی ہوں گے۔ یہ طلبا جن خانساماؤں کے پاس رہتے ہیں وہ ان کی امداد سے مذہبی ثواب ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ اکثر اپنی لڑکیوں کو بہت سا جہیز دے کر انہی مسلمان طلبا سے ان کا نکاح بھی کر دیتے ہیں۔ نوجوان طلبا معمولی زمیندار گھرانوں سے آتے ہیں۔ وہ انگریزی یا سائنس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے انہیں فارسی کا بھی زیادہ خیال نہیں ہوتا۔ وہ صرف عربی صرف ونحو اور قوانین کی اصطلاحات کو رٹتے رہتے ہیں۔ گھروں میں ان کے کام چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں ہل چلانا یا کشتی رانی کرنا ہے۔ وہ دہانہ گنگا کے زمینداروں کی اکھڑ زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس کا سمجھنا کلکتہ کے مسلمان کے لئے ناممکن ہے۔

یہ اس مسلمان طالب علم کا نقشہ ہے جو ابھی ابھی کالج میں داخل ہوا تھا۔ وہ

---

[1] خانساماں غریب طالب علموں کو اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ اس طرح پڑھانے پہنانے اور رہنے کو جاگیر کہتے ہیں۔ یہ وہ نام ہے جو اسلامی سلطنت کے فوجی تعلقوں کو دیا جاتا تھا۔

چند سال میں اپنی وحشیانہ عادات کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی داڑھی ترشوا کر شریعت اسلامی کے عالم ہونے کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے ہماری فیاض حکومت سو میں سے اٹھائیس کو وظیفہ دیتی ہے اس طرح ہر طالب علم کو جو تھوڑا بہت کام بھی کرے جلدی یا بدیر وظیفہ مل جاتا ہے اس اثنا میں جو طالب علم زیادہ ہوشیار مگر کم محنتی ہوں گے وہ معمولی سا تجارتی کاروبار بھی شروع کر دیں گے۔ اُن کا زیادہ بہتر حصہ بغلوں کے اندر کتابیں دبائے کلکتہ کے بازاروں میں پھرتا ہے وہ اپنی وظیفہ خوارانہ حیثیت اور ناداری کو بھولتے ہوئے انہی خانساماؤں سے جن کے طفیل ان کی زندگی بسر ہوتی ہے اُسی تعظیم و تکریم کا مطالبہ کرتے ہیں جو ایک عالم دین کی ہونی چاہیے قاضیوں کی تنگ نظرانہ برطرفی کی وجہ سے اسلام کے شخصی قوانین کا نفاذ غیر تربیت یافتہ کارکنوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے کالج کے طالب علم ادنےٰ طبقہ کے مسلمان گھرانوں میں نکاح خوانی کرتے اور وراثت کے تنفیے حل کرتے ہیں۔ وہ ہدایہ اور جامع العروض کے مطابق غلط سلط فتوے فروخت کرتے پھرتے ہیں۔

محمڈن کالج کے ان نادار طلبا سے بڑھ کر نوجوانوں کی کوئی جماعت صحیح رہنمائی کی محتاج نہیں۔ جس قسم کی رہنمائی اُن کو میسر ہے اس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ہماری تربیت کا یہ اندازہ ان کو ہر سال اپنے محدود طریقہ تعلیم پر اور زیادہ مطمئن اُن کے اخلاق کو اور زیادہ معیوب اور زندگی کے کسی شعبے میں سرگرمی سے حصہ لینے کے اور زیادہ ناقابل اور ہماری حکومت کے خلاف بے وفائی کے جذبات پیدا

کر دیتا ہے وہ انگریزوں کی صورت سے بیزار ہوں گے۔ جب یہ نقائص زبان زد
خاص و عام ہوئے تو لامحالہ ایک مستقل انگریز پروفیسر کا تقرر ضروری ہو گیا جسے رات
کی تاریکی میں نہایت خاموشی کے ساتھ کالج کے اندر لانا پڑا[1]۔ نوے سال سے زیادہ
عرصہ ہوا یہاں کافروں کے خلاف جہاد کی پسندیدہ تعلیم دی جا رہی تھی ۱۸۶۸ء
یا ۱۸۶۹ء تک (صحیح تاریخ کا مجھے علم نہیں) امتحان کے سوالات باقاعدگی سے
اسی اصول جہاد میں سے آیا کرتے تھے۔ ایک باغیانہ تعلیم دینے والی مسجد اسی کالج
کے سایہ میں پرورش پا رہی تھی[2] یہ طالب علم کلکتہ میں باغیوں کی تمام مساجد میں آتے
جاتے رہتے ہیں موجودہ ہیڈ مولوی اُس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء
کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا
تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیئے جائیں۔ اس
غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود
ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کالج کے ایک مقیم انگریز پروفیسر نے ایک عرب کو
نکال دیا تھا کیونکہ وہ یہاں مذہب کی تبلیغ کرنے آیا تھا بالفاظ دیگر ان اصولوں
کی جن کی بدولت ہمیں تین سرحدی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور ہماری سلطنت میں سازش
کا جال پھیلا ہوا ہے۔

---

[1] سٹر لوک مین۔ بدقسمتی سے انگریز پروفیسر جو وہاں رہتا ہے اُس کو عربی کے اعلے محکمہ پر کوئی اختیار نہیں

[2] فرازی مسجد۔

اس قسم کی ہفت سالہ تعلیم کے بعد ہم مسلمان نوجوانوں کو اُنہی مشرقی صوبجات میں بھیج دیتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ بدقسمتی سے اس سے بھی زیادہ افسوسناک صورت حالات کا بیان کرنا ابھی باقی ہے۔ میں پچھلے دو سال کا ذکر نہیں کروں گا جب کہ خاص کمیشن اپنا کام کر رہی ہے مگر صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ریکارڈ پر ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ کچھ عرصہ ہوا بعض لڑکے فاحشہ عورتوں کو کالج میں لے آتے تھے۔ ان میں سے تقریباً چھبیس کو باقاعدہ الگ الگ کمرے ملے ہوئے تھے گویا گورنمنٹ نے جو زمین ان کو رہنے کے لئے عطا کی تھی اسے بدکاری کے اڈوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر ان عورتوں کے علاوہ جو کارلائل کے نزدیک ناقابل ذکر ہیں یہ طلبا فطرت کے خلاف اُن خطرناک گناہوں میں بھی پھنسے ہوئے تھے جن کو عیسائیت نے یورپ میں بالکل نیست و نابود کر دیا۔ مگر جن کا ارتکاب ہندوستان کے ہر ایک شہر میں ابھی تک جاری ہے۔ گذشتہ پانچ چھ سالوں میں تین وارداتیں پکڑی گئیں اصل میں کتنی وارداتیں ہوتی ہوں گی ان کا علم کبھی نہیں ہو سکتا۔

اُن طلبا میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوشش کریں گے کہ ضرور اپنے آپ کو بہتر بنا سکیں۔ لیکن ان کے لئے بھی

سلہ یہاں اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرنل لیسی جو کالج کا وقتی پرنسپل تھا اس کا ذمہ دار نہ تھا اور اس کو ان فاحشہ عورتوں کا پتہ چلا تو اس نے ایسا انتظام کیا کہ پھر اس کا اعادہ نہ ہو سکے۔

کوئی ایسا انتظام نہیں ملے گا جو کسی صحیح یا کارآمد عملی تعلیم کا ذریعہ بن سکے پہلی بات تو یہ ہے کہ پڑھائی کا روزانہ وقت بہت ہی کم رکھا گیا ہے۔ مقررہ وقت دس بجے سے دو بجے تک کا ہے جس میں سے بیس منٹ تو اس کام کے لئے وضع کر لینے چاہئیں جو اُستادوں اور شاگردوں کے حقہ پینے میں گزرتا ہے اور جسے کالج کی خاص اصطلاح میں عصائے موسیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آدھ گھنٹہ حاضری کے لئے کیونکہ یہ رسم دن میں دو دفعہ ادا کرنی پڑتی ہے اس لئے کہ بہت سے طالب علم بارہ بجے کے بعد ہی چلے جاتے ہیں۔ جو طلبا زیادہ محنتی ہوتے ہیں وہ کالج کے معمولی نصاب کے علاوہ مسلمانوں کے نجی اسکولوں میں بھی دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن کالج سے باہر کی یہ تعلیم احادیث اور متعصب زمانے کی پرانی فقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور نوجوانوں کے دماغ میں ہمچو ما دیگرے نیست کا خیال پیدا کر رہی ہے خود کالج کی چاردیواری میں معمولی مسئلوں پر انتہائی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایک مقیم انگریز پروفیسر کو شام کے گشت میں لڑکوں کے کمروں سے شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ تمہارا ایمان ٹھیک نہیں اور اسی قسم کے بہت سے جملوں کی آواز برآمدے میں پہنچ رہی تھی معلوم ہوتا تھا ہر طرف سخت لے دے ہو رہی ہے۔ یہ پروفیسر اسی وقت موقع پر پہنچ گیا اور جب اُس نے شور و غل کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ کسی طالب علم نے فقہ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ نماز میں دونوں ایڑیاں ملی ہوئی چاہئیں ورنہ اُس سے دین اور دنیا میں کوئی

فائدہ نہیں ہوگا اس پردہ لوگ جو ایڑیاں کھول کر نماز پڑھتے تھے اس نئے طرز کے حامی کو بدترین ملحد کہنے لگے۔ لہٰذا اس کے جواب میں وہ اور اُن کے چند ساتھی پرانے طرز والوں کو دوزخی اور جہنمی ٹھہراتے رہے۔

یہ طلبا کالج کے استادوں سے ہر روز زیادہ سے زیادہ تین گھنٹہ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ایک شخص نے جو عملی طور پر ان سے واقف ہے مجھ سے ذکر کیا کہ اصل پڑھائی صرف اڑھائی گھنٹے ہوتی ہے۔ گھر پر کسی قسم کی تیاری کرنا وہ جانتے ہی نہیں یوں بھی یہ بات مسلمانوں کے اصول کے خلاف ہے۔ ہر استاد ایک عربی فقرہ پڑھتا ہے پھر اس کے پہلے دوسرے تیسرے لفظ کے معنی بتلاتا ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ آخری فقرے تک پہنچ جائے۔ جو طالب علم محنتی ہوگا وہ استاد کے بتلائے ہوئے معنوں کو بین السطور میں لکھتا جائے گا اور پھر تھوڑا تھوڑا کرکے فقرے کے معنی اور شرح کو حفظ کرے گا۔ ان کے لئے گھر پر لغت کے استعمال کا طریقہ بتلانا یا فقرے کے معنی از خود دریافت کرنے کی ترغیب دینا ایک بالکل اجنبی ایجاد ہے جو شاید ان کے مذہب کے لئے بھی خطرناک ہو بہرحال کلکتہ کالج میں اس طریق درس کو کوئی نہیں جانتا۔ سات سال کے بعد طالب علم کو چند کتابیں حفظ ہو جاتی ہیں یعنی ان کا متن اور ان کی شرح۔ اگر اُن کے محدود نصاب سے باہر کوئی معمولی سی تحریر بھی اُن کے سامنے آجائے تو وہ اُس کو بالکل نہیں سمجھتے لہٰذا اس امر سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیم اُن

چیز کے متعلق جو انہوں نے حاصل نہیں کی ناقابل برداشت حقارت پیدا کر دیتی ہے
ان کا کچھ نہ جاننا ہی اُن کو زیادہ خود پسند بنا دیتا ہے۔ وہ اس کو قطعی حقیقت جانتے
ہیں کہ عربی صرف و نحو، فقہ، علم انشاء اور منطق ہی دنیا میں پڑھنے کے
لائق ہیں۔ انہوں نے یہی پڑھا ہے کہ دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں پہلے
عرب تھے پھر انگلستان فرانس اور روس۔ مکہ، مدینہ اور قاہرہ کے بعد دنیا
کا سب سے بڑا شہر لندن ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انگریز کافر ہیں اور اگلی
دنیا میں اپنے آپ کو دوزخ میں پائیں گے۔ جن طلباء میں اتنی بڑی فراست جمع ہو
جائے وہاں اور کیا چاہیئے؟ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پرنسپل نے جب سائنس کا ایک
ناپاک مضمون رائج کرنا چاہا اور وہ بھی اُنہی کی زبان یعنی اُردو میں تو کیا وہ اُس پر
پتھر اور بوسیدہ آم پھینکنے میں حق بجانب نہ تھے۔

میں نے اس تکلیف دہ تفصیل کو اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کی اہمیت
بہت زیادہ ہے اور اب جب کہ حکومت مسلمانوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کے
معاملے میں دانستہ بیدار ہو چکی ہے اُس کو چاہیئے کہ ایسے طریقوں سے پرہیز کرے
جن کے ماتحت اُس کی سابقہ عظیم الشان کوششیں خاک نامرادی میں مل گئیں
کلکتہ کا محمڈن کالج عملی طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ انہیں
کے انتظام کا نتیجہ ہے کہ وہ اتنا بدنام اور بے عزت ہوا۔ مسلمان قوم کی انحطاط پذیر
قسمت کے ساتھ شروع میں ہماری ہمدردی اور بعد میں لاپروائی نے حکومت کو

اس ادارے میں دخل انداز ہونے سے روکے رکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ادارہ بالکل ناکارہ ہے مگر اس کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کو کس طرح سدھارا جائے۔ سو سال کے ہندوستانی انتظام نے اس نظام کو مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق بنانے کی بجائے اس کو ان بدگمانیوں کے مطابق بنا دیا۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے محمڈن کالج کا انتظام بہت کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا یہاں تک کہ ۱۸۱۹ء میں اوپر کی سب باتیں صاف طور پر نظر آنے لگیں مگر اس وقت کی حکومت امید کے خلاف یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ وقت آنے پر محض یورپین سکرٹری کا تھوڑا سا اختیار کافی ہوگا۔ گذشتہ بیس سال سے کالج کی اصلاح میں باہمی دخل اندازی ناراضامندی کا موجب ہوتی رہی اور اسی نے تمام کوششوں کو ناکام بھی رکھا۔ آخرکار جب پرنسپل کا تقرر ہوا بھی تو محض اعزاز اور نمائش کے لیے پھر جب مقیم انگریز پروفیسر کی باری آئی تو اس کا احاطۂ اقتدار اس شعبہ پر جاکر ختم کر دیا گیا جہاں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ حکومت بہت تھوڑے خرچ سے ساتھ مسلمانوں کے جملہ طبقات کے لیے خاطر خواہ تعلیمی انتظام کر سکتی ہے۔ یہ نظام ادنےٰ وسطی اور اعلیٰ تعلیم پر مشتمل ہوگا۔ ادنےٰ تعلیم کے لیے امدادی سکولوں میں گرانٹ ان ایڈ کے قانون کا فیاضانہ استعمال کافی ہے یہاں روپے کی اتنی ضرورت نہیں

جتنی مسلمانوں کی خاص ضروریات کے خیال کی۔ حکومت نے بڑی عقلمندی سے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ ان سکولوں کی امداد نہیں کرے گی جو ایک دوسرے سے پانچ میل سے کم فاصلہ پر ہوں گے۔ کیونکہ اس قسم کی امداد حکومت کو نقصان پہنچا کر بے فائدہ رقابت پیدا کر دے گی۔ چالاک ہندو اس میں بھی دیگر امور کی طرح سب سے پہلے میدان میں موجود ہے اُس نے تمام ملک میں ایسے سکولوں کا جال پھیلا دیا ہے جو اُس کی ضروریات کے عین مطابق ہیں اور وہ مسلمانوں کی ضروریات کے بالکل خلاف۔ اس لیے اس پانچ میل کے قانون کو ذرا نرم کر دینا چاہیے تاکہ اُن اسلامیہ سکولوں کو گرانٹ مل سکے جو ہندوؤں کے سکول سے اس فاصلہ کے اندر واقع ہوں۔ جہاں علیحدہ اداروں کی ضرورت نہیں وہاں حکومت کو مسلمانوں کے لیے انتظام کرنا چاہیے اور موجودہ ہندو سکولوں میں ایک کم تنخواہ کا مسلمان استاد مقرر کر دینا چاہیے۔ اس قسم کے مسلمان استاد پانچ شلنگ ہفتہ پر مل سکتے ہیں۔

جہاں تک متعصب مشرقی اضلاع کا تعلق ہے میرے خیال میں حکومت کے لئے یہ امر ازحد مفید ثابت ہوگا کہ وہ مسلمان کاشتکاروں تک پہنچنے کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کرے۔ ایک وقت میں ایسا محکمہ ہندوؤں کے لئے بھی ضروری خیال کیا گیا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے اُن اضلاع میں تعلیم پھیلانے کے لیے بہت سے سکول کھولے تھے جہاں ایسے سکول جاری نہ ہو سکتے تھے جو

اپنا خرچ خود برداشت کر سکیں ۱۸۶۶ئہ میں اس طرح کے صرف اڑتیس سکول بنگال کے تعلیمی حلقے میں میرے ہی ماتحت تھے ان پر گورنمنٹ کے ۱۰۰ پونڈ سالانہ خرچ ہوئے فیس ان کے علاوہ تھی جس کی کل رقم ۲۶۰ پونڈ ہوتی تھی ظاہر ہے کہ یہ سکول گو اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کے بالکل ناقابل تھے۔ مگر ان سے جو فائدہ پہنچا اس میں مبالغہ کرنا مشکل ہے جہاں کہیں بھی زمیندار بہت جاہل بہت غریب یا امدادی سکولوں کے جاری کرنے میں بہت زیادہ تعصب سے کام لیتے تھے وہاں عارضی طور پر ہارڈنگ انسٹیٹیوٹ قائم کر دی جاتی پہلے پہل تو دیہاتی اپنی تعلیم مفت حاصل کرتے ہیں مگر جوں جوں تعلیم یافتہ جماعت پیدا ہوتی گئی اور وہ زیادہ تعلیم کی خواہش کرنے لگے تو اس وقت ان سے فیس بھی لے لی جاتی تھی۔ اس طرح چند سال میں خود امدادی کا کچھ ذریعہ پیدا ہو جاتا۔ اب اس انسٹیٹیوٹ کی جگہ ایک ہائی سکول لے لیتا اور وہ ماسٹر کسی دوسرے پسماندہ علاقہ میں منتقل ہو جاتی۔ اس طرح تعلیم کا سلسلہ جنوب مغربی بنگال کے دور دراز جنگلوں میں رائج کیا گیا[۱]

میرے خیال میں متعصب مشرقی اضلاع میں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے

---

[۱] ۱۸۶۵-۶۶ئہ میں جنوب مغربی حلقہ میں ۳۰۳ سکول تھے اور ان میں طالب علموں کی تعداد ۱۰۴۲۳ تھی۔

گرانٹ ان ایڈ کے قواعد اس آبادی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو موروثی طور پر ہماری حکومت سے متنفر اور ہمارے طریقہ تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر ارزاں قسم کے پچاس سکول قائم کر دیئے جائیں جن میں کم تنخواہ لینے والے مسلمان اُستاد ہوں اور جن کے خرچ کا بہت سا حصہ حکومت خود برداشت کرے تو ایک ہی نسل میں مشرقی بنگال کے لوگوں کے رویہ میں تبدیل ہو سکتی ہے اس قسم کے اداروں کو شروع میں بہت کم کامیابی ہوگی مگر آہستہ آہستہ وہ مسلمان زمینداروں کے نوجوان لڑکوں[1] ہی کو اپنی طرف نہیں کھینچیں گے بلکہ اُن مسلمان اُستادوں کو بھی جو اب اپنے طور پر غیر معین روزی کماتے ہیں اور جن کے لیۓ حکومت کی طرف سے پانچ شلنگ ہفتہ کی زائد آمدنی بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی اس طرح ہم اُس جماعت کو اپنا طرف دار بنا لیں گے جو اس وقت ہماری مخالفت میں سب سے پیش پیش ہے۔

یہاں تک تو مسلمانوں کی ادنٰے تعلیم کے متعلق تھا درمیانہ درجوں کی تعلیم میں اس سے بھی کم تبدیلیاں کرنی پڑیں گی وہابی مقدمات کے انچارج

---

[1] میری رپورٹ کے وقت ۱۸۶۵-۶۶ء میں ۳۰ ہارڈنگ اور موڈل سکول جنوب مغربی علاقہ میں تھے۔ طالب علموں کی تعداد ۱۸۶۱-۶۲ء کی ۱۴۳۱ تعداد سے ۲۰۲۴ ہوگئی۔

افسر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اضلاع کے گورنمنٹ سکولوں میں مولویوں کا تقرر ہونا چاہیے۔ یہ ذراسی تبدیلی ہی کافی ثابت ہو گی مولوی عام مضامین کو اردو میں پڑھائیں گے اور اسے اچھی طرح سکھلا بھی سکیں گے مزید براں وہ طلبا کو فارسی سے روشناس کرا سکتے ہیں اور شاید تھوڑی سی عربی بھی پڑھا دیں۔ اضلاع کے گورنمنٹ سکولوں کو اختیار دینا چاہیئے کہ مسلمان لڑکوں میں انگریزی سیکھنے کا شوق جس طرح چاہیں پیدا کریں۔

ان تبدیلیوں پر اگرچہ بہت ہی کم صرف ہوگا لیکن مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے ایک مکمل اور قابل تحسین نظام حکومت کے لئے حکومت کو ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنی پڑے گی۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کے محمڈن کالج کے لئے ایک بہت بڑی رقم مقرر کر رکھی ہے پھر ہگلی کے عظیم الشان انسٹی ٹیوٹ کو اگر صحیح طریقے پر خرچ کیا جائے تو یہی روپیہ اس غرض کے لئے کافی ہوگا۔ اس وقت تک ہم جو رقم بے ایمانی سے ایک انگریزی کالج کے اخراجات پر صرف کر رہے ہیں اُس کو دیانتداری سے اُس کام پر خرچ کرنا چاہیئے جس کے لئے واقف نے حقیقتہً اسے وقف کیا تھا۔ کیا ایک اچھا کالج دو کالجوں سے بہتر نہ ہو گا؟ اس کالج کو کلکتہ میں ہونا چاہیئے یا ہگلی میں جو کلکتہ سے چوبیس میل کے فاصلے پر ہے یہ جزئی باتیں ہیں جن کو بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ جیسا کہ اب دستور ہے تعلیم کا زائد حصّہ

مسلمان مولویوں کے سپرد ہونا چاہئے۔ البتہ ہر کالج میں ایک ایسے یقیم انگریز پرنسپل کی موجودگی ضروری ہے جو عربی سے بھی واقف ہو اور اس قابل کہ اپنے ماتحتوں کی عزت کے ساتھ نگرانی کر سکے اُس عہدے کے لئے ۱۲۰۰ سے ۱۵۰۰ پونڈ سالانہ تنخواہ پر انگریزی یا جرمن یونیورسٹیوں سے کوئی نہ کوئی قابل آدمی مل سکتا ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم شعبوں پر منقسم نہ ہوگی جیسا کہ کلکتہ کالج میں دستور ہے اور جہاں اعلےٰ شعبہ میں پہنچ کر طالب علم ہر اُس شے کو بھول جاتا ہے جو اُس نے ادنے شعبہ میں حاصل کی تھی۔ اس تعلیم کے لئے ایک اچھی طرح سے ترتیب دیا ہُوا مسلسل نصاب ضروری ہوگا۔ عربی کا اعلے شعبہ انگریزی عربی میں تبدیل کر دیا جائے اور وہ انگریزی فارسی کے ادنیٰ شعبوں میں نہایت آسانی سے ترقی کرتا ہُوا تعلیم کے اعلیٰ درجات تک جا پہنچے گا۔ یہ امر بیشک مشکوک ہے کہ آیا اسلامی فقہ کی تعلیم بھی باقاعدہ ہونی چاہئے اور سب کے لئے لازمی۔ کیونکہ اسلامی فقہ کا مطلب مذہب اسلام ہے۔ اور یہ وہ مذہب ہے جس کے پیرو تمام دنیا کو جائز طور پر اپنا مال غنیمت سمجھتے ہیں اور ان اسلامی سلطنتوں کی ذمہ داریوں سے قطعاً ناآشنا ہیں جو عیسائی حکومتوں کے ساتھ اتحاد رکھتی یا اُن کے ماتحت ہیں۔

لیکن یہ امر بھی دانشمندی سے بعید ہوگا کہ فقہ کی تعلیم کو سرے سے اُڑا دیا جائے کیونکہ اُس کو موقوف کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ نسل کے نزدیک

کالج کی کوئی وقعت نہ رہے گی۔ پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلامی فقہ کے پڑھانے کا اصلی مقصد یعنی مستند قاضی پیدا کرنا اب فوت ہو چکا ہے۔ حکومت کو اس تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور نہ اس کے پڑھنے والے کو زندگی میں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کی مناسب تعلیم علیحدہ لیکچروں میں دی جا سکتی ہے۔ بعینہ جس طرح ہندو قانون کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی میں دی جاتی ہے بالفعل فقہ کی روزانہ تعلیم کی جگہ عربی یا فارسی ادبیات کو دی جا سکتی ہے۔ جہاں تک مغربی سائنس کا تعلق ہے اُسے اُردو زبان میں پڑھایا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم مسلمانوں کی ایک ایسی اضافہ پذیر نسل تیار کر لیں گے جس کا علم اپنے ہی تنگ دائرے میں محدود نہ ہوگا وہ صرف اپنے قوانین کے تلخ اصول سے واقف نہیں ہو گی بلکہ اُن میں سنجیدہ اور حقیقی مغربی علوم کی روح بھی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذہبی قوانین سے بھی اتنی واقفیت ضرور ہوگی جس سے اپنی قوم میں عزت کی جگہ پا سکیں اُن کی انگریزی تعلیم اُن کو زندگی کے منفعت بخش شعبوں میں داخل ہونے کے لئے مدد دے گی۔

مسلمانوں کی ادنےٰ اور درمیانہ درجہ کی تعلیم کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز مقرر کرنا چاہئے جو اُن کا ہم مذہب ہو اس قسم کا افسر ۲۰۰ پونڈ سالانہ پر مل سکتا ہے۔ اس کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان اسلامی مدرسوں اور کالجوں کا پتہ لگائے اور اُن کے متعلق رپورٹ کرے جو ہندوستانیوں کے

زیر اہتمام چل رہے ہیں بہت سے ایسے مدارس اب تک گوشہ گمنامی میں پڑے ہیں جن کا ہمارے تعلیمی انسپکٹروں کو کچھ علم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن میں سے بعض نے ابھی تک اچھا خاصا معیار قائم کر رکھا ہے۔ پھر اگر ہم اس بات کا اندازہ بھی کر سکیں کہ وہ کس لائحہ عمل پر کاربند ہیں اور ان سے ہم کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں تو اور زیادہ بہتر ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ باقاعدہ انگریزی افسروں کی نگرانی پر کبھی رضامند نہ ہوں گے پھر بھی اُن میں بہت سے مدرسے ایسے بھی نکل آئیں گے جو اپنے ہم مذہب ڈپٹی انسپکٹر کے معائنہ پر راضی ہو جائیں اور یہ گرانٹ ان ایڈ کی ایک آسان سی شرط ہوگی اس طرح ہم بنگال کے باغیانہ اداروں کو اگر وفاداری کی طرف نہیں تو کم از کم امن و امان کی طرف ضرور مائل کر سکیں گے۔ فی الحال اُن طفلانہ بیوقوفیوں کے بجائے جو مسلمان اپنے مدرسوں میں پڑھتے ہیں اچھی اور عمدہ کتابوں کا سلسلہ جاری کرنا چاہیئے کالجوں کو پورے اطمینان کے ساتھ اُن کے انگریز پرنسپلوں کی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ ان کے لئے کافی رقم موجود ہے بشرطیکہ اُس کا صحیح استعمال ہو سکے حکومت کو بہرکیف اس میں ایک پائی بھی خرچ کرنا نہیں پڑے گی۔

اس طرح ہم مسلمان نوجوانوں کو اپنے خیال کے مطابق تعلیم دے سکیں گے پھر اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کئے بغیر دوران تعلیم میں ان کو

اس بات کا موقعہ دیتے ہوئے کہ وہ اپنے مذہبی فرائض سے واقفیت پیدا کریں ہم شاید اُن کے مذہب کو کم سچا ثابت نہ کر سکیں ان کے تعصب کو یقینی طور پر کم کر سکیں گے مسلمانوں کی یہ نئی نسل بھی اُسی راستہ پر گامزن ہو جائے گی جس پر چل کر ہندو جو دُنیا کی متعصب ترین قوم تھی اب فراخ دل ہو گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کا ایمان اب اتنا راسخ نہیں رہا جتنا اُن کے آبا واجداد کا تھا اُن کی فراخ دلی نے اُن کو بالکل آزاد کر دیا ہے بعینہٖ وہ مسلمانوں کو بھی اُن مظالم کے ارتکاب اور مجرمانہ حرکات اور تکالیف کی کوفت سے آزاد کر دے گی جو انہوں نے ایک غلط مذہب کے نام پر روا رکھی ہیں۔ میں اُن اعمال و افعال کو بیان کرنا نہیں چاہتا جن سے لاپرواہی برت کر ہی ہندو اور مسلمان اعلےٰ عقیدے کو پہنچ سکتے ہیں۔ بہر حال مجھے کامل یقین ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب ہمارا یہی طریقہ تعلیم جس نے اب تک اُلٹے اثرات پیدا کئے ہیں اس مقصد تک پہنچنے کے لئے پہلا زینہ ثابت ہو گا گو اس کے نتائج بہت دیر میں ظاہر ہوں در اصل اب تک ہندوستان میں انگریزوں کی حیثیت صرف یہ رہی ہے کہ انہوں نے معمولی طور پر رسم و رواج کو توڑا۔

اس دوران میں حکومت کا فرض ہو گا کہ مسلمانوں کی بداعتمادی کو سختی کے ساتھ دور کرتی رہے اور اُن کے لئے اس کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دے اسے ان کی رعایت بھی کرنی پڑے گی نہ صرف اُس تباہی کی وجہ سے جو ہماری

فتح اور حکومت کی تبدیلی کے باعث اُن پر نازل ہوئی بلکہ اس لیے بھی کہ ہماری ہمدردی کے مفقود ہونے سے اُن کی بربادی ناقابلِ برداشت اور آخری حد تک پہنچ گئی ہے مسلمانوں کی بے وفا جماعت کے ساتھ اس کا رویہ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ اُس سے نہ صرف حکومت کے انصاف کی تعریف ہو بلکہ عام رائے میں بھی اسے قابلِ توصیف گردانا جائے۔ ایک قرارداد واقعی مجرم[51] کے خلاف بے سلیقہ رویہ نے روم کے فلسفی اور بہت ہی نیک نام شہنشاہ کی یاد پر صدیوں تک دھبہ لگائے رکھا تھا۔ اب تک ہم نے میدانِ جنگ کے سوا کہیں بھی کسی کا خون نہیں گرایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہادت کے شوق نے لوگوں کو وہابیوں کی فوج میں داخل ہونے کی بجائے بہتوں کو اُن سے منحرف کر دیا۔ اس وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں انگریزی فوج کو گوشت بہم پہنچانے والا بدنام شخص[52] جس کو ۱۸۶۴ء میں موت کی سزا ہوئی تھی۔ پٹنہ میں اپنے ہم مذہب بھائیوں کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ اگر اُس کی اصلی سزا پر عمل کیا جاتا تو ہر سال ہزاروں زائرین اُس کی خانقاہ پر زیارت کے

---

[51] جبین (JULLIBN) کے ماتحت افریقہ کا والسرائے۔ نوٹری گوڈینیس اور مصر کا ظالم ڈیوک۔

[52] محمد شفیع

لئے آیا کرتے۔ ہر زمانہ میں مذہب کے لئے مرنا بدکرداری کی زندگی کو نیک نام کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمارے دہلی کے بوچڑ سے بھی زیادہ بدکردار فوج کو گوشت بہم پہنچانے والے کی قسمت حکومت کو ایسی سزا دینے پر تنبہ کر رہی ہے جس کو اس کی مسلمان رعایا شہادت کی موت تصور کرے گی۔ حکومت اس واقعہ کو کبھی فراموش نہ کرے کہ کس طرح کیپیڈیشا کا رہنے والا جارج جو مفت خوری کی ملعون زندگی بسر کرتا اور رومن فوج کو سور کا گوشت بہم پہنچانے کا وعدہ پورا نہیں کر سکتا تھا ایک بے جان بادری کی زندگی بسر کرتے ہوئے بن مانگی موت کے باعث پرستش کا مستحق ٹھہرا اور سرزمین انگلستان میں جارج ولی کے نام سے مشہور ہوا۔

ضمیمہ نمبر ۱

مکّہ کے علما کا فتوےٰ

سوال

آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے خدا آپ کے اقبال کو بلند کرے!
کیا ملک ہندوستان جس کے حاکم عیسائی ہیں اور جو اسلام کے تمام احکامات
میں مداخلت نہیں کرتے مثلاً روزانہ نماز عیدین کی نماز۔ وغیرہ وغیرہ مگر اسلام کے
بعض احکام کو چھوڑ دینے کو جائز سمجھتے ہیں مثلاً وہ اُس شخص کو اپنے مسلمان آبا و اجداد
کی جائداد کا وارث قرار دیتے ہیں جو مرتد ہو گیا ہو اور عیسائی بن گیا ہو دار الاسلام
ہے یا نہیں۔ مندرجہ بالا کا جواب دیں اور اللہ سے اس کا اجر پائیں۔

جواب نمبر ۱

(اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ) سب تعریف اللہ کے لیے ہے
جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔

(رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا) خدا میرے علم کو بڑھائے!

"جب تک اسلام کے بعض مخصوص احکام جاری ہیں وہ دارالاسلام ہے"۔

اللہ سب کچھ جاننے والا اور بے عیب ہے اور سب سے بڑا ہے۔

یہ فتویٰ اُس شخص نے دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخفی عنایات کا آرزومند ہے
جو خدا کی تعریف کرتا ہے اور اُس کے رسول پر درود بھیجتا ہے۔

دستخط جمال ابن عبداللہ شیخ عمر الحنفی مکہ معظمہ کا موجودہ مفتی۔
خدا اُس پر اور اُس کے باپ پر رحم فرمائے۔

جواب نمبر ۲

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو واحد ہے اور خدا ہمارے رسول اور
اُس کی آل اور اُس کے اصحاب اور اُس پر ایمان لانے والوں پر رحمت فرمائے
(نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و آلہ و صحابہ و خدباتبا اجمعین)

اے خدا میں تجھ سے نیکی کا راستہ چاہتا ہوں (اھدنا الصراط المستقیم)

"ہاں جبتک کہ اُس میں اسلام کی بعض خصوصیات جاری ہیں وہ دارالاسلام ہے"
خدا ہی سب کچھ جاننے والا ہے وہ بے عیب ہے اور سب سے بڑا ہے۔
یہ اُس شخص نے لکھا ہے جو خدائے مہربان سے نجات کا طالب ہے خدا اُس کو اُس کے والدین کو اُس کے اُستادوں کو اُس کے بھائیوں کو اُس کے دوستوں کو اور تمام مسلمانوں کو معاف فرمائے۔

دستخط احمد بن ذینی دلہم مکّہ معظمہ کے شافعی مذہب کا مفتی

جواب نمبر ۳

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو ایک ہے اور خدا میرے علم کو بڑھائے
یہ امر دسوکی کی شرح میں مرقوم ہے کہ دارالاسلام اُس وقت دارالحرب نہیں بن جاتا جب وہ کافروں کے ہاتھ میں چلا جائے بلکہ اُس وقت دارالحرب بنتا ہے جب اُس میں اسلام کے تمام یا بہت سے احکام جاری نہ رہیں"
خدا عالم الغیب ہے خدا کی رحمتیں ہمارے رسول پر اُس کی آل پر اور اُس کے اصحابہ پر نازل ہوں۔

دستخط بقلم خود حسین بن ابراہیم مالکی مذہب کا مفتی مکہ معظمہ

ضمیمہ نمبر ۲

شمالی ہند کے علماء کا فتویٰ

استفتاء:- مترجمہ سید امیر حسین پرسنل اسسٹنٹ کمشنر بھاگل پور

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ:-

"ہندوستان میں جہاد جائز ہے، یہ ملک پہلے مسلمان بادشاہ کے ماتحت تھا اور اب عیسائی حکومت کے زیر اقتدار ہے، یہ عیسائی بادشاہ اپنی مسلمان رعایا کے مذہبی فرائض میں مداخلت نہیں کرتا مثلاً روزہ، حج، زکوٰۃ، نماز جمعہ اور نماز باجماعت اور مسلمانوں کو ان فرائض کی ادائیگی کی پوری پوری آزادی ہے، وہ مسلمانوں کو پناہ دیتا ہے بعینہٖ جیسے کوئی مسلمان بادشاہ دیگا۔ یہاں مسلمان رعایا کے پاس نہ اپنے حاکموں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہے نہ ان کے پاس ہتھیار ہیں۔ برخلاف اس کے اگر لڑائی شروع کر دی جائے تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا"

فتوے بتاریخ ۱۷ ربیع الثانی مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء اس جگہ

مسلمان عیسائیوں کی امان میں ہیں اور اُس مُلک میں جہاد واجب نہیں جہاں اہلِ اسلام کو پناہ حاصل ہو۔ جہاد کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کو پناہ اور آزادی حاصل نہ ہو لیکن یہاں یہ حالت نہیں۔ مزید برآں یہ ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اُس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔

اس جگہ مولویوں نے ایک عربی متن درج کیا ہے جو منہاج الغفار اور فتاوے عالمگیری سے منقول ہے۔

مہریں

مولوی محمد علی لکھنوی۔ مولوی عبدالحی لکھنوی۔ مولوی فیض اللہ لکھنوی۔ مولوی محمد نعیم لکھنوی۔ مولوی رحمت اللہ لکھنوی۔ مولوی قطب الدین دہلوی۔ مولوی مفتی سعد اللہ لکھنوی۔ مولوی لطف اللہ رامپوری مولوی غلام علی رامپوری۔

ضمیمہ نمبر ۳

محمڈن سوسائٹی کلکتہ کا فیصلہ

شمالی ہندوستان کے علماء کے فتوے کی مخالفت کرتے ہوئے یعنی یہ کہ

"ہندوستان دارالاسلام ہے"

مولوی کرامت علی یوں رقمطراز ہیں:۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ملک میں جہاد جائز ہے یا نہیں۔ لیکن اس کو پہلے سوال کے ساتھ حل کر دیا گیا ہے کیونکہ دارالاسلام میں جہاد کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں۔ یہ امر اس قدر واضح ہے کہ اس کی حمایت کے لئے کوئی دلیل یا مثال پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ اب اگر کوئی گم کردہ راہ مجنوں اپنی الٹی قسمت کی وجہ سے ملک ہندوستان کے انگریز حاکموں

کے خلاف جنگ شروع کر دے تو اس قسم کی جنگ کو بغاوت تصوّر کیا جائے گا اور بغاوت اسلامی فقہ میں سخت منع ہے۔ اس لئے یہ جنگ بھی ناجائز ہوگی۔ اگر کوئی شخص کسی حالت میں بھی ایسی جنگ کرے گا تو مسلمان اپنے حاکموں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گے۔ اور اُن کے ساتھ مل کر باغیوں سے جنگ کریں گے۔ مندرجہ بالا امر صاف طور پر فتاویٰ عالمگیری میں موجود ہے ؛

مطبوعہ رہبر پریس، لاہور